فہرست

لمعات:

اسلام۔۔عالمی رائے عامہ کیسے بدلے؟	محمد سلیم اختر	3
سیلاب اور رسی	آصف جاوید سکندر، کراچی	5
حضرت انسان قرآن کے آئینے میں	آصف جلیل، کراچی	9
انبیاء کرامؑ کے اقوال و اعمال خود اختیاری ہوتے تھے	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی، کراچی	13
اللہ و رسول ﷺ کی اصطلاح	غلام باری، مانچسٹر	24
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹ واں پارہ)	غلام احمد پرویزؒ	29
''ماں کے پاؤں تلے جنت ہے''۔''اس دنیا میں بھی''	تنویر مفتی، سویڈن	49
علامہ اقبالؒ سے سعادت مندانہ ملاقاتیں	مولانا حافظ غلام مرشد مرحوم، لاہور	54

احادیث نبوی ﷺ

رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز بتاؤں جو نماز روزہ سے بھی افضل ہے۔ صحابہؓ نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ چیز ہے باہمی تعلقات کا درست رکھنا۔ (ابوداؤد)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ بعض نے ہم میں سے روزہ رکھا اور بعض نے نہیں رکھا۔ ہم ایک روز ایک منزل میں اترے جن لوگوں نے روزہ رکھا تھا وہ اپنے کاموں میں مصروف رہے چنانچہ انہوں نے خیمے کھڑے کئے اور اونٹوں کو پانی پلایا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ آج وہ لوگ جنہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا سارا ثواب لے گئے۔ (بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

لمعات

اسلام۔۔۔عالمی رائے عامہ کیسے بدلے؟

اس حقیقت سے دشمن بھی انکار نہیں کرسکتا کہ اسلام وہ دین ہے جس نے بنی نوع انسان کے لئے مکمل اور موثر ضابطہ حیات اور منشور پیش کیا ہے تاکہ انسانی شب وروز سکون واطمینان سے گزریں اور ان میں کسی قسم کی کوئی بدنظمی یا انتشار پیدا نہ ہو لیکن افسوس کہ مسلمانوں کو یہ بات کہنی اور سمجھانی پڑتی ہے جبکہ اس کی روشنی ان کے افعال واطوار سے پھوٹنی چاہئے۔ چونکہ ایسا نہیں ہوتا اس لئے جو بات اظہر من الشمس ہے ہمیں اس کا بھی تعارف پیش کرنا پڑتا ہے۔ دورِ حاضر میں دشمنانِ اسلام کی سازشوں' حربوں اور ہتھکنڈوں کی وجہ سے اگر پوری دنیا میں مسلمان دفاعی رخ اپنانے پر مجبور ہیں تو اس کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے کہ مسلمان' اسلامی تعلیمات کو عملاً عام کرنے میں ناکام ہیں جس کے پیشِ نظر دشمنانِ اسلام کو کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ ان کروڑوں لوگوں کو بہکانے اور اسلام کے خلاف ورغلانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جو اسلام سے واقف نہیں ہیں۔ دور نہ جاتے ہوئے اگر ہم جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس کی مثالیں ہمارے آس پاس بھی بکھری ہوئی ہیں۔ کسی بھی غیر مسلم دانشور' ممتاز شخصیت اور اگر یہ نہیں تو کسی عام آدمی سے گفتگو کرلیجئے' اس کا ذہن اسلام مخالف پروپیگنڈے سے آلودہ تو ملے گا' حقیقی اسلامی تعلیمات سے واقفیت کے سبب جس طرح روشن ہونا چاہئے قطعی نہیں' ملے گا۔ آئے دن ٹرینوں' بسوں اور دیگر عوامی مقامات پر متشرع مسلمانوں کے ساتھ جو لوگ تحقیر آمیز سلوک کرتے ہیں وہ بنیادی طور پر مسلم دشمن نہیں ہیں بلکہ متذکرہ پروپیگنڈے کا شکار ہیں جس کے سبب ان میں مخاصمانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس کہ پوری دنیا میں اسلام مخالف پروپیگنڈہ تو جاری ہے لیکن اس زہر کے تریاق کے لئے ہماری جو تیاری ہونی چاہئے' نہیں ہے۔ ہم اسلام کو بہترین مذہب نہیں بلکہ دین مانتے ہیں لیکن اس کی روشنی سے انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے ظاہر و باطن کو منور نہیں کرتے جس کے نتیجے میں اسلام دیگر قوموں کے لوگوں تک نہیں پہنچتا اور وہ بہت آسانی سے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر مسلمانوں سے کدورت وحقارت رکھنے لگتے ہیں۔ سیرتِ طیبہؐ کا مطالعہ قرآن کریم کی روشنی میں' ہمیں جو پیغام دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کو اپنے اندر رچا بسا لیں۔ اسلام کا' جو بھی پیغام ہے اس کا ترشح ہماری شخصیت سے' ہمارے معاملات سے' ہمارے اطوار سے' ہماری گفتگو سے' ہمارے رکھ رکھاؤ سے اور ہمارے شب وروز سے ہونا چاہئے۔ بالفاظِ دیگر' کیا جھوٹ بولنے والا مسلمان یہ پیغام عام کرسکتا ہے کہ اسلام سچ بولنے کی تعلیم دیتا

ہے؟ کیا دوسروں کی حق تلفی کرنے والا مسلمان یہ وضاحت پیش کر سکتا ہے کہ اسلام حق ادا کرنے کی ہدایت دیتا ہے؟ کیا چوری کرنے والا مسلمان یہ سمجھا سکتا ہے کہ اسلام میں چوری کے خلاف سخت وعید ہے؟ کیا غلیظ گلیوں محلوں میں رہنے والا مسلمان یہ باور کرا سکتا ہے کہ اسلام میں ''صفائی نصف ایمان ہے''؟ کیا ایک جاہل اور ناخواندہ مسلمان عوام الناس کو بتا سکتا ہے کہ اسلام کی پہلی ہدایت ''اقراء'' ہے؟ یقیناً نہیں۔ اسلام کی صحیح تصویر اور تصور پیش کرنے کے لئے تحریروں' تقریروں اور دعووٴں سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اسلام کے پیکر میں ڈھل کر بلکہ حضورﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے مطابق قرآنِ کریم کا چلتا پھرتا نمونہ بن کر اپنے عمل کے ذریعہ اپنے دین کا تعارف پیش کریں۔ جو یقینی طور پر بے حد موثر ثابت ہوگا۔ چونکہ موجودہ دور میں ایسا نہیں ہو پا رہا ہے اور مسلمانوں کی عمومی شبیہہ اس حد تک خراب ہو چکی ہے کہ دنیا بھر کے لوگ اس قوم کو ہر طرح کی خرابیوں میں کمر کمر تک دھنسا ہوا محسوس کر رہے ہیں اس لئے ہماری دفاعی حکمت عملی بھی کچھ بہت زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہو رہی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جاوید سکندر، کراچی

سیلاب اور رسی

زندگی ایک حقیقت ہے اور ''حقیقت'' دراصل ''زندگی'' ہے۔ تو پھر حقیقت کو پانے کے لئے اتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ جتنی زندگی کو بچانے کے لئے۔

ذرا تصور کریں اس شخص کے بارے میں جس کے قصبے میں شدید بارش کے بعد طوفانی سیلاب آ گیا تھا اور اس شخص کا گھر اس سیلابی دریا کے عین کنارے پر تھا۔ وہ اپنے بچوں اور بیوی سمیت گھر کی چھت پر کھڑا سیلاب کی تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے خالق و مالک کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس کا گھر اور خاندان ابھی تک اس تباہی سے محفوظ تھے۔

اور پھر اچانک وہ کچھ ہو گیا۔ جس کا اس نے سوچا بھی نہ تھا اور یہ ہوا کیسے۔۔۔؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو قریب پڑی ہوئی کرسی کی طرف بڑھا تھا۔ مگر پتہ نہیں کس طرح لڑکھڑاتا ہوا گرا اور ہوا میں لہراتا ہوا سیدھا بہتے ہوئے پانی میں جا پڑا۔ پانی کے انتہائی شور کے باوجود بیوی بچوں کی چیخ پکار اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ مگر شدید گھبراہٹ کی وجہ سے ہوش وحواس بحال رکھنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اسے تو تیرنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ مکمل طور پر لہروں کے رحم وکرم پر تھا۔ جو اسے نامعلوم منزل کی طرف لئے جا رہی تھیں اور اسے قریب آتی ہوئی موت صاف نظر آ رہی تھی اور وہ بے اختیار ادھر ادھر ہاتھ مار رہا تھا۔ مگر وہاں کوئی چیز اس کی مدد کے لئے موجود نہ تھی۔

ایسے میں اسے کچھ یوں احساس ہوا جیسے سانپ کی طرح کوئی چیز اس کے قریب لہرا رہی ہے۔ عام حالات میں تو وہ ڈر کر دور ہٹ جاتا مگر ان حالات میں جب موت یقینی نظر آ رہی تھی۔۔۔ اس نے جھپٹ کر اس سانپ نما شے کو پکڑ لیا۔ مگر اسے کوئی فائدہ محسوس نہ ہوا اور وہ بدستور بہتا رہا۔ تاہم ہاتھ آنے والی چیز کو اس نے چھوڑا نہیں۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ چیز اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ اگر وہ فوری طور اپنی گرفت مضبوط نہ کر لیتا تو وہ چیز اس کے ہاتھ سے نکل جاتی۔

اب اس کا بہنا رک گیا تھا۔ پانی پر اوندھے منہ لیٹے ہوئے اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔۔۔ گہری سانس لی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں سانپ۔ نہیں بلکہ رسی تھی۔ جسے رسا کہنا زیادہ صحیح تھا۔ جس نے اسے بہنے سے روک دیا تھا مگر اس کی ہتھیلیوں پر شدید دباؤ تھا۔ دراصل اس کے پورے جسم کا وزن ہتھیلیوں پر تھا۔ پانی اسے بہاؤ کی طرف کھینچ رہا تھا اور رسی پر اس کی مضبوط گرفت اسے بہنے سے روک رہی تھی۔

اس نے رسی کا دوسرا سرا دیکھنے کی کوشش کی جو اس کے خیال میں کسی جھاڑی وغیرہ سے اٹکا ہوگا۔ مگر حقیقت میں یہ ایک امدادی ٹیم کی کاروائی تھی۔ اس ٹیم کی پہلی نظر جب اس پر پڑی تو وہ اسے ایک لاش سمجھے تھے۔ مگر جلد ہی ان کو محسوس ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ تو انہوں نے یہ رسی اس کی طرف اچھال دی تھی۔ امدادی ٹیم ایک ٹیلے پر تھی۔ جس کے چاروں طرف سے سیلابی پانی گزر رہا تھا۔ ان کی ناؤ ناکارہ ہو چکی تھی۔

اب اس شخص کی زندگی کا انحصار اس بات پر تھا کہ وہ اس رسی کو ہاتھ سے چھوٹنے نہ دے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ جیسے تیسے اس رسی کے دوسرے سرے تک۔۔۔ یعنی اس ٹیلے تک پہنچ جائے جہاں پر زندگی اور راحت اس کی منتظر تھی۔ دوسری صورت میں تکلیف زخم اور آخر کار موت یقینی تھی۔ زندگی اور موت کی اس کشمکش میں اس کی جدوجہد میں موجود شدت کا حقیقی تصور صرف وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو کبھی اس جیسی صورتِ حال سے دوچار رہا ہو۔

اس کے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے تھے۔ جن پر رسی کی رگڑ سے ہونے والی تکلیف اس کے لئے ناقابل برداشت تھی مگر وہ زندگی کے لئے لڑ رہا تھا اور زندگی کے لئے بڑی سے بڑی تکلیف اٹھانا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے زخمی ہاتھوں کی پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسری جانب امدادی ٹیم کے افراد بھی رسی کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ دیکھنے والے لوگ بھی شور مچا کر اسے ہمت دلا رہے تھے۔ ان میں سے بہت سوں کی آوازیں اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ مگر لوگ گویا اس کے ساتھ شریک تھے۔ ہر ایک ڈر رہا تھا کہ رسی کہیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔ وہ اپنے گھر والوں سے اگرچہ دور نکل آیا تھا مگر چھت پر کھڑے اس کے بیوی بچے بمشکل تمام اس منظر کو دیکھ چکے تھے۔ اور ان کو کچھ امید سی لگ گئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر دعائیں تھیں۔

ادھر اس کے ہاتھوں میں ہونے والی تکلیف ایسی جلن بن چکی تھی جیسے اس کے ہاتھوں میں انگارے بھرے ہوں۔ امدادی ٹیم کا ولولہ بھی لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔ موت ہارتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور زندگی کی علامت وہ ٹیلہ تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ عزم

وہمت نے موت کو شکست دے دی۔

جب وہ ٹیلے پر پہنچا تو وہ خوف اور تھکاوٹ سے بے حال تھا مگر احساسِ عافیت سے نہال تھا۔ یکے بعد دیگرے دو جوس کے پیکٹ پینے کے بعد اس کی توانائی قدرے بحال ہوئی۔تو ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی۔اور پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر وہ کہنے لگا۔ اے لوگو۔۔۔! تم نے اس شخص کی جدوجہد کو دیکھا۔ اب اس کے ہاتھوں پر زخم دیکھو۔'' اس شخص کا انداز کچھ مقررانہ تھا اور لوگ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے اور پھر لوگوں نے جب اس کی زخمی ہتھیلیاں دیکھیں تو بہت سوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں' کچھ نے منہ پھیر لئے۔خراشوں سے رستا ہوا خون دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ جبکہ امدادی ٹیم عارضی آرام پہنچانے والی دوائی لگانے کی تیاری کر رہے تھے۔''لوگو۔۔۔!'' وہ شخص ایک مرتبہ پھر مخاطب ہوا۔''میری بات غور سے سنو۔ ہمارے لئے آج کے اس واقعے میں ایک بہت بڑا سبق ہے۔دیکھو پانی کا یہ سیلاب تو آج آیا ہے مگر گمراہی کا سیلاب تو سالہا سال سے آیا ہوا ہے جس نے پوری دنیا کو اپنے لپیٹے میں لیا ہوا ہے۔گمراہی کے اس سیلاب کے باعث ایمان کے جنازے نکل رہے ہیں' یقین ڈوب رہا ہے' تقویٰ دم توڑ رہا ہے اور ''ہدایت'' زیرِ آب آ گئی ہے۔اگر ایسے میں کوئی امدادی ٹیم نہ آئی تو گمراہی کے اس سیلاب میں بہتے بہتے ہم جہنم کے اس سمندر میں گر جائیں گے جہاں موت کا سارا سامان موجود ہوگا' موت ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی مگر ہم زندہ رہیں گے لیکن وہ زندگی موت سے بدتر ہوگی۔ہم چیخ چیخ کر موت کو پکاریں گے مگر اسے بھی ہم پر رحم نہیں آئے گا کہ وہ آ کر ہمارا قصہ ہی تمام کر دے۔ہم تمنا کریں گے کہ کاش مر کر مٹی ہو جائیں مگر ایسا نہیں ہوگا۔'' یہاں پہنچ کر وہ شخص تھوڑی دیر کے لئے رکا۔اس کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ پورے انہماک سے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ ''دوستو ہمیں بھی ایک ایسی رسی کی ضرورت ہے جو ہمیں گمراہی کے اس سیلاب میں بہہ جانے سے روک لے۔کیا تمہیں ایسی رسی چاہئے جو تمہیں گمراہی کی موت سے بچا کر ہدایت کی زندگی عطا کرے۔۔۔؟''اس سوال کے جواب میں سب نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر زور سے کہا۔ ''ہاں۔۔۔ہاں ہمیں ایسی رسی چاہئے۔۔۔!''۔

''میرے عزیز دوستو۔۔۔! رسی تو میں تمہیں ضرور دوں گا اور وہ رسی ضرور بالضرور تمہیں گمراہی کے اس سیلاب سے بچا لے گی جو ہماری ہر جانب ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔جس کی لہروں نے عاقبت کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے اور اس سیلاب میں ''خرافات'' کے بھنوروں نے ''حقیقت'' کو منجھدار میں پھنسا رکھا ہے لیکن یہ رسی ہر بھنور اور ہر منجھدار سے نکال کر ''حقیقت آشنا'' کر دے گی۔ مگر تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔اس رسی کو مضبوطی سے تھامنا

ہوگا۔ اگرچہ تمہارے ہاتھ اس شخص کے ہاتھوں سے زیادہ زخمی ہو جائیں۔۔۔ چاہے تکلیف کے ہاتھوں تمہارا سارا جسم چیخ اٹھے۔ مگر رسی کو نہیں چھوڑنا۔ اسی میں تمہاری روح کی سلامتی اور حقیقی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔۔۔ بولو! اس رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا وعدہ کرتے ہو۔'' جواباً سب نے کہا۔ ''ہاں۔۔۔ ہاں ہم وعدہ کرتے ہیں۔'' ایسے لگ رہا تھا جیسے ان تمام لوگوں کے دل و دماغ اس پُر تاثیر مقرر کی گرفت میں ہوں۔

''تو لوگو سن لو۔۔۔ وہ رسی ''وحی'' ہے۔ ''آخری وحی'' جو آخری نبی کے ذریعے صرف ''قرآن'' کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے اور اسی قرآن میں ارشادِ ربی ورنکم ہے کہ: **واعتصموا بحبل الله**' یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔ اور اکثر مفسرین کے نزدیک اللہ کی رسی سے یہاں مراد ''قرآن'' ہی ہے۔ لوگو۔۔۔ یہ صرف قرآن ہی ہے جو موجودہ تاریکی کے طوفان کو روشنیوں سے منور کر کے خرافات میں چھپا ہوا ''حقیقت'' کا چہرہ عیاں کر سکتا ہے اور ہمیں گمراہی کے سیلاب سے بچا کر ہدایت کی منزل دلا سکتا ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ اسے مضبوطی سے تھام لو چاہے زخموں سے ہاتھ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ اور جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے کیونکہ حق کو پانے کے لئے جسم کی پروا نہیں کی جاتی بلکہ روح کو پراگندہ اور آلودہ ہونے سے بچانا اصل مقصود ہے۔ یہی تزکیہ ہے اور یہی وہ نشو و نما ہے جو لحہ بہ لحہ ہمیں بلند سے بلند تر زندگی کی طرف لئے چلی جاتی ہے۔''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل، کراچی
asif.jalil1@gmail.com

حضرت انسان قرآن کے آئینے میں

(قسط ۹)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (22:11).

بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ ایک کنارے پر (کھڑے) ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر کوئی نفع مل گیا تو دلچسپی لینے لگتے ہیں اور اگر کوئی آفت آ گئی تو اسی وقت منہ پھیر لیتے ہیں؟ انہوں نے دونوں جہان کا نقصان اٹھالیا۔ واقعی یہ کھلا نقصان ہے۔

یعنی وہ دو کشتیوں کی سواری کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی ذہنیتوں کو تلاش کرنے میں کوئی محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ ہر روز ہمارا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑتا رہتا ہے۔ مشکل میں ہوں تو اپنے تئیں وہ اللہ کو خوش کرنے کے لئے نمازیں اور نوافل ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اصل بات تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ کے کس حکم کی خلاف ورزی کے نتیجے میں مسائل کا شکار ہوئے ہیں۔ اللہ کی ہدایت پر ہمہ وقت عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وقتی طور پر یا مصائب درپیش ہونے پر تو عمل کر لیا جائے اور جب ان سے نکل جائے تو بھلا دیا جائے تو ایسا کرنے سے جو نقصان ہوتا ہے وہ ناقابل تلافی ہوتا ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ اَلنَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ (22:72)۔

جب ان کے سامنے ہمارے کلام کی کھلی ہوئی آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو آپ کافروں کے چہروں پر ناخوشی کے صاف آثار پہچان لیتے ہیں' وہ تو قریب ہوتے ہیں کہ ہماری آیتیں سنانے والوں پر حملہ کر بیٹھیں' کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں اس سے بھی زیادہ بدتر خبر دوں وہ آگ ہے جس کا وعدہ اللہ نے کافروں سے کر رکھا ہے' اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

خود کو مسلمان کہلوانے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ایسی آیات کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا کیونکہ ذکر تو کافروں کا ہو رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ تو مخصوص رویوں کی بات کر رہا ہے نہ کہ

مخصوص لوگوں کی۔ اس لئے محض یہ اطمینان کافی نہیں ہے کہ ہم مسلمان ہیں بلکہ اس بات کا یقین کرنا بھی ضروری ہے کہ کہیں ہم اللہ کی کسی ہدایت کے خلاف عمل تو نہیں کر رہے؟ جو بھی اللہ کا کلام پیش کیے جانے پر ناخوشی کا اظہار کرتا ہے اس کا شمار کفر کرنے والوں میں ہوگا۔ عجیب بات ہے کہ آج بھی اگر کوئی یہ کہے کہ صرف وہی بات صحیح ہوگی جو قرآن کریم کے مطابق ہوگی تو اس کی شدید مخالفت کی جاتی ہے ان لوگوں کی طرف سے جو اسلام کے دعویدار ہیں۔ فرقوں میں بٹے ہوئے لوگ اور ان کے مذہبی راہنما ایک دوسرے کو کسی حد تک برداشت کر لیتے ہیں اور جیو اور جینے دو کے اصول پر متفق ہو جاتے ہیں لیکن اگر انہیں کہیں سے قرآن کریم کا پیغام عام ہونے کی خبر مل جائے تو سب متحد ہو کر اس کی مخالفت میں کمربستہ ہو جاتے ہیں۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِىْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ☆ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ (23:24-25)۔

اس کی قوم کے کافر سرداروں نے صاف کہہ دیا کہ یہ تو تم جیسا ہی انسان ہے، یہ تم پر فضیلت اور بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ ہی کو منظور ہوتا تو کسی فرشتے کو اتارتا، ہم نے تو اپنے اگلے باپ دادوں کے زمانے میں سنا ہی نہیں۔ یقیناً اس شخص کو جنون ہے پس تم اسے ایک وقت مقرر تک ڈھیل دو۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے، جو لوگ لیڈر بنے بیٹھے ہوتے ہیں وہ اللہ کے پیغام کو نہ ماننے کے لیے بہانے تراشتے رہتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہ عام آدمی کیوں ہیں، اللہ نے کسی بڑے آدمی (ان کی سوچ کے مطابق) کا انتخاب کیوں نہ کیا؟ یا پھر کوئی فرشتہ بھیج دیتا۔ دوسرا اعتراض یہ کہ ایسی باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادوں سے نہیں سنی۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہونے اور اللہ کا آخری پیغام قرآن کریم میں محفوظ ہو جانے کے بعد کچھ لوگوں نے اپنے طور پر سمجھ لیا ہے کہ وہی اسلام کی صحیح تشریح کر سکتے ہیں۔ وہ عام آدمی کو یہ اختیار دینے کو تیار نہیں ہوتے کہ وہ ان کی مدد کے بغیر اس پیغام کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بھی براہ راست اللہ کے کلام کو معیار بنانے کی بجائے اسلاف پرستی پر شدت سے قائم ہیں۔ خود کو عقلمند اور دوسروں کو پاگل قرار دینے کی روش آج بھی قائم ہے۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ☆ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (23:33-34)۔

اور سرداران قوم نے جواب دیا، جو کفر کرتے تھے اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور ہم نے انہیں دینوی زندگی میں خوشحال کر رکھا تھا، کہ یہ تو تم جیسا ہی انسان ہے، تمہاری ہی خوراک یہ بھی کھاتا ہے اور تمہارے پینے کا پانی ہی یہ بھی پیتا ہے۔ اگر تم نے اپنے

جیسے ہی انسان کی تابعداری کر لی تو بے شک تم سخت خسارے والے ہو۔

یہاں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے پیغام کی مخالفت کرنے والے کون ہوتے ہیں اور ان کا اعتراض کیا ہوتا ہے۔ مخالفت کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو لیڈر بنے ہوتے ہیں اور دولت مند بھی ہوتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے پیغامبر عام لوگوں میں سے کیوں ہیں۔ لوگوں کی اسی سوچ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اپنے آپ کو دوسروں سے منفرد بنانے کے لئے آج کل کے مذہبی راہنما مخصوص حلیہ بنا کر سادہ لوح لوگوں کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں۔

وَيَوۡمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيۡهِ يَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِى اتَّخَذۡتُ مَعَ الرَّسُوۡلِ سَبِيۡلًا ☆ يٰوَيۡلَتٰى لَيۡتَنِىۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِيۡلًا ☆ لَقَدۡ اَضَلَّنِىۡ عَنِ الذِّكۡرِ بَعۡدَ اِذۡ جَآءَنِىۡ وَكَانَ الشَّيۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا (25:27-29)۔

اور اس دن ظالم شخص اپنے ہاتھوں کو چبا چبا کر کہے گا ہائے کاش کہ میں نے رسول ﷺ کی راہ اختیار کی ہوتی۔ ہائے افسوس کاش کہ میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے تو مجھے اس کے بعد گمراہ کر دیا کہ نصیحت میرے پاس آ پہنچی تھی اور شیطان تو انسان کو (وقت پر) دغا دینے والا ہے۔

یہاں اس شخص کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو بلا سوچے سمجھے کسی کے پیچھے لگتا ہے۔ جب نتائج سامنے آتے ہیں (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) تو وہ افسوس کا اظہار کرتا ہے لیکن اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا حالانکہ اللہ کی ہدایت تو سب کے لیے ہے اور صحیح اور غلط کا معیار وہی ہے۔ ہر انسان کو اپنا عمل اس کی روشنی میں پرکھنا چاہیے۔

اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا (25:44)۔

کیا آپ اسی خیال میں ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں۔ وہ تو نرے چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے۔

انسان کو اشرف المخلوقات کہنے والوں کو اللہ کی اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر انسان سننے اور سمجھنے کی صلاحیت کا استعمال نہ کرے تو وہ جانوروں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ اشرف المخلوقات بننے کے لیے لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ افسوس ہے کہ مذہب کے ٹھیکیدار سب سے پہلے عوام الناس کو اسی صلاحیت سے محروم کرتے ہیں۔ یہ جملہ تو ہر کسی کو رٹا دیا گیا ہے کہ مذہب کے معاملے میں عقل کا استعمال کرو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ جو اللہ تعالیٰ کی بات کو بھی غلط (معاذ اللہ) ثابت کرنے پر تلا ہو وہ معاشرے میں کتنا فساد نہیں پھیلائے گا؟ قبائلی علاقوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس امر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡۤا اٰلَ لُوۡطٍ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ

(27:56)۔

قوم کا جواب بجز اس کہنے کے اور کچھ نہ تھا کہ آل لوط کو اپنے شہر سے شہر بدر کر دو' یہ تو بڑے پاکباز بن رہے ہیں۔

یہاں پر ایک اور ردِعمل کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ جب لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی تو وہ دوسرے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ جن میں طاقت کا استعمال ہوتا ہے۔ انہیں میں سے ایک طریقہ شہر بدر کرنے کا ہے۔ جیسے آج کل پورے ملک میں ڈنڈے کے زور پر ''اسلام'' لانے کی کوششیں ہو رہی ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ وَ مَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ☆ وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ وَ لَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (29:12-13)۔

کافروں نے ایمان والوں سے کہا کہ تم ہماری راہ کی تابعداری کرو تمہارے گناہ ہم اٹھالیں گے' حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی نہیں اٹھانے والے' یہ تو محض جھوٹے ہیں۔ البتہ یہ اپنے بوجھ ڈھولیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ ہی اور بوجھ بھی اور جو کچھ افتراپردازیاں کر رہے ہیں ان کی بابت ان سے باز پرس کی جائے گی۔

یہاں پر بھی اس ذہنیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ دوسروں کو غلط کاموں پر اکسانے والے بظاہر ان کو یقین دہانی کرا رہے ہوتے ہیں کہ انہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں یہ خود نتیجہ بھگت لیں گے لیکن جب نتائج کا وقت آتا ہے تو اُس وقت یہ لوگ اپنے آپ کو بچانے میں لگ جاتے ہیں۔ اللہ کے قانون کے مطابق کوئی شخص دوسرے کے حصے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ یعنی جو کرے گا وہی بھرے گا۔ البتہ گمراہ کرنے والے کے بوجھ میں اضافہ اس لیے ہو جاتا ہے کہ وہ جھوٹ اور فریب دہی جیسے جرائم بھی کرتا ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْۤ اُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (31:7)۔

جب اس کے سامنے ہماری آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو تکبر کرتا ہوا اس طرح منہ پھیر لیتا ہے گویا اس نے سنا ہی نہیں گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں' آپ اسے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

جو رویہ اس آیت میں بتایا گیا ہے اسے کوئی بھی اپنائے گا اس کا انجام بھی یہی ہوگا۔ قرآن کی آیات کو سن کر روایت پسند لوگ اسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ وہ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ایسی آیات ان کے لئے نہیں ہیں۔ حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو عالم دین ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کہ کیا ایسی آیات ان کی نظر سے نہیں گزرتیں یا وہ جان بوجھ کر ایسا رویہ اپناتے ہیں۔ بہرحال اللہ نے تو نتیجہ بتا دیا ہے جس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

انبیاء کرامؑ کے اقوال و اعمال خود اختیاری ہوتے تھے

اس کائنات میں ہر چیز قانون خداوندی کے مطابق عمل کر رہی ہے اور کسی چیز کو بھی اختیار و ارادہ کی صلاحیت عطا نہیں کی گئی ہے۔ اس بھری کائنات میں اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کو اختیار و ارادہ اور غور وفکر کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ دیگر مخلوقات پر انسان کا شرف ومجد صرف اسی وجہ سے ہے۔ اس میں اختیار وارادہ اور غور وفکر کی صلاحیت موجود ہے۔ جسے یہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے، قرآن کریم کی تعلیم کا مرکزی نقطہ ہی قانون مکافات عمل ہے، یعنی یہ کہ انسان اپنے ہر عمل کا ذمہ دار ہے۔ اگر اس کو اپنے اعمال پر اختیار وارادہ حاصل نہ ہو، تو اس کے لئے جزا وسزا کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر اس تصور کی رو سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت، انبیاء کرام کی بعثت، اور وحی الٰہی کا نازل کرنا، سب بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں جو شخص بھی قرآن کریم پر ایمان لاتا ہے اسے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ایک ایک عمل کا جواب دہ ہونا ہوگا۔

قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے برخلاف ہم مسلمانوں میں ایک ایسا عقیدہ چلا آ رہا ہے جو قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے۔ اور اس عقیدہ کی رو سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام انبیاء کرام کے اقوال و اعمال خود اختیاری نہیں ہوتے۔ آپ کو اس بات کے پڑھنے سے انتہائی تعجب ہوگا کہ جب انسان کی وجۂ فضیلت ہی یہ اختیار وارادہ ہے، تو انبیاء کرام کو اس شرف سے کس طرح محروم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے اور اس سلسلہ میں آپ کا تعجب اس طرح دور ہو سکتا ہے کہ آپ خود مستند علماء کرام کی تحریر ملاحظہ فرمالیں، صرف اس طرح آپ کی حیرت از خود دور ہو جائے گی۔ اگرچہ ہمارے ہر فرقہ کی پیشوائیت، اس مسئلہ میں پوری طرح متفق ہے، لیکن ان کے اس اتفاق کے باوجود یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے۔ اور اس بارے میں ان کا

اتفاق قرآن کریم کے خلاف ہے۔ جس کے دلائل آپ کی خدمت عالی میں پیش کئے جائیں گے۔ پہلے آپ اس نظریہ کے متعلق چند مستند علماء کرام کی تحریرات ملاحظہ فرمالیں۔

(1) حضرتِ اقدس جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، علماء کرام میں ایک خاص مقام کے حامل ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہونے کے علاوہ وہ ''الرشید'' اور ''القاسم'' کے مدیر بھی رہے تھے۔ اس کے بعد وہ طویل مدت تک جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن (بھارت) سے منسلک رہے کئی بلند پایہ کتب کے مصنف تھے۔ ان کی ایک معروف کتاب ''تدوین حدیث'' ۔ علماء کرام میں بے مثال کتاب شمار ہوتی ہے اور ''منکرینِ حدیث'' کے لئے تریاق کے مانند گردانی جاتی ہے۔ یہ کتاب 624 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے صفحہ 371 پر حضرت اقدس نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کو بغور پڑھئے (اور سَر دھنئے)۔ آیۂ کریمہ **وما ینطق عن الھویٰ** کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ ''یعنی قرآن ہی نہیں بلکہ نطق اور گفتگو جو بھی پیغمبر کی زبان سے نکلتی ہے اس کا قطعاً اَلْھَــوٰیٰ (پیغمبر کی ذاتی خواہش) سے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ قرآن نطق ہو یا غیر قرآن نطق پیغمبر کا ہر نطق اور ان کی ہر گفتگو وحی ہے جو ان پر خدا کی طرف سے کی جاتی ہے۔'' تین سطروں کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے ''اور ان کی ہر زبان کا ہر بول ذاتی فکر یا خواہش کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ سب وحی ہے۔''

(2) اسی آیۂ کریمہ کے ذیل میں حضرت شیخ الاسلام مولانا عثمانی فرماتے ہیں: ''یعنی کوئی کلام تو کیا ایک حرف بھی آپ کے دہن مبارک سے ایسا نہیں نکلتا جو خواہش نفس پر مبنی ہو۔ بلکہ آپ جو کچھ دین کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں وحی متلو کو قرآن اور غیر متلو کو حدیث کہا جاتا ہے۔ (صفحہ 698)۔

(3) حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری، بریلوی فرقہ کے سرخیل و سرتاج شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تفسیر ان کے ہر فرقہ میں نہایت بلند پایہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں رقم فرماتے ہیں:

> ''بعض علماء نے ان آیات کے پیش نظر حضور ﷺ کے اجتہاد کا انکار کیا ہے یعنی حضور ﷺ کوئی بات اپنے اجتہاد سے نہیں کہتے بلکہ جو ارشاد ہوتا ہے وہ وحی الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔'' (جلد پنجم، ص 11)۔

(4) تفسیر ابن کثیر میں ہے:

> ''آپ کا کوئی قول، کوئی فرمان، اپنے نفس کی خواہش اور ذاتی غرض سے نہیں ہوتا بلکہ جس چیز کی تبلیغ کا آپ کو حکم الٰہی ہوتا ہے آپ اسے ہی زبان سے نکالتے ہیں۔ جو وہاں سے کہا جائے وہ ہی آپ کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ کمی بیشی، زیادتی

نقصان سے آپ کا کلام پاک ہوتا ہے۔'' (جلد پنجم' ص179)۔

آپ نے مستند علماء کی تحریرات اور مستند تفاسیر ملاحظہ فرمائیں جن سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمارے علماء کرام حضورﷺ کے تمام اقوال و افعال کو من جانب اللہ خیال فرماتے ہیں۔ جن میں حضورﷺ کی ذاتی فکر اور حضورﷺ کے ذاتی اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اور علماء کرام کی یہ تمام کوششیں صرف اس وجہ سے ہیں کہ کسی طرح احادیث کو وحی خفی قرار دے دیا جائے۔ لیکن قرآن کریم تمام انبیاء کرام کے افعال واقوال کو خود اختیاری قرار دیتا ہے جس کے ثبوت کے لئے مندرجہ ذیل آیات پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں:

1- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ (7:6)-

پھر ہم ضرور ان لوگوں سے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے تھے (ہر چیز کا) سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے۔

آیہ کریمہ میں سوال کرنے' یعنی باز پرس' کا لفظ' پیغمبروں اور امتیوں دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ دونوں سے جواب دہی کے لئے ایک ہی لفظ آیا ہے اور جہاں تک جواب دہی کا تعلق ہے رسول اور غیر رسول سب برابر ہیں۔ انبیاء کرام کے افعال و اقوال زیر محاسبہ اور باز پرس کے تابع ہیں تو وہ وحی الٰہی کیسے ہو سکتے ہیں۔ ان افعال واقوال کی باز پرس جب ہی ہو سکتی ہے جبکہ وہ انبیاء کرام کے خود اختیاری افعال واقوال ہوں اور ان کے ذاتی غور وفکر کے نتائج ہوں۔

2- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ (43:44)-

اور یہ قرآن تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے قانون ہے اور عنقریب ہی تم سے باز پرس کی جائے گی۔

آیہ کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح تمہاری قوم سے باز پرس ہو گی' اسی طرح تمہارے سے بھی جواب دہی ہو گی۔ آیہ کریمہ میں لک کے لفظ کا اضافہ کر کے' حضورﷺ کو اس جوابدہی میں شامل کر لیا گیا ہے کہ خود حضورﷺ سے بھی ان کے افعال واقوال کی جوابدہی ہو گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ خود حضورﷺ کے افعال خود اختیاری تھے۔

3- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ (24:54)-

اے رسول تم کہہ دو کہ خدا کی اطاعت کرو' اور

رسول کی اطاعت کرو' اس پر بھی اگر تم سرتابی کرو گے تو رسول پر اتنا ہی واجب ہے جس کے وہ ذمہ دار کئے گئے ہیں اور جس کے تم ذمہ دار بنائے گئے ہو وہ تم پر واجب ہے۔

آیہ کریمہ میں حضورﷺ کو اپنے فرائض کے لئے اسی طرح ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے جس طرح دوسرے لوگوں کو ان کے اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ حضورﷺ کے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہونے کے بارے میں ''تدبر قرآن'' میں مرقوم ہے:

''تمہارے معاملہ میں رسول کے اوپر صرف اتنی ذمہ داری ہے جو اللہ کی طرف سے اس پر ڈالی گئی ہے''۔ (جلد 5'ص 425)۔

تفسیر نمونہ میں ہے:

''اگر تم منہ موڑ لو اور منحرف ہو جاؤ تو رسول اپنے اعمال کا جواب دہ ہے (اور اس نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی ہے) اور تم بھی اپنے اعمال کے جواب دہ ہو۔ (جلد 8'ص 286)۔

حضورﷺ کے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہونے کے بارے میں شیخ الاسلام جناب عثمانی نے تحریر فرمایا:

''یعنی پیغمبر پر خدا کی طرف سے تبلیغ کا بوجھ رکھا گیا ہے۔ سو اس نے پوری طرح ادا کر دیا اور تم پر جو بوجھ ڈالا گیا ہے وہ تصدیق اور قبولِ حق کا ہے۔''

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ یہاں پر خود علماء کرام کس طرح حضورﷺ کو ان کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔

4- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

مَّا أَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا أَصَابَکَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِکَ(4:79)-

جب تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو یہ خدا کی طرف سے ہے اور تم کو جو کوئی تکلیف پہنچے تو وہ خود تمہاری وجہ سے ہے۔

آیہ کریمہ میں واضح طور پر حضورﷺ کو تکلیف پہنچنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ رسول ایک بشر ہوتا ہے اس کی بشری عقل کو مدد دینے کے لئے وحی الٰہی نازل ہوتی تھی۔ لوگوں کو بھی اس وحی الٰہی سے وہی فائدہ ہوتا تھا جو رسول کو ہوتا تھا۔ ان کی بشری عقل کو وحی الٰہی سے تائید ہوتی تھی۔ بس وحی کے علاوہ رسولوں کا کام بشری عقل سے اجتہاد کرنے کا تھا اور اس میں اسی طرح غلطی کا امکان تھا جس طرح دوسرے مجتہدین کے اجتہاد میں ہوتا ہے۔

5- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِکَ (40:59, 47:19)-

اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے۔

حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم دن میں سو بار استغفار

فرماتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ''حضرت رسول اللہ ﷺ دن میں سوسو بار استغفار کرتے'' ہر بندہ کی تقصیراس کے درجہ کے موافق ہے اس لئے ہر کسی کو استغفار ضروری ہے۔ حضرت شیخ الہند' ص629۔

اوپر وہ آیات درج کی گئی ہیں جن سے حضور ﷺ کے اعمال کو خود اختیاری ثابت کیا گیا ہے۔ اس قسم کی اور بھی آیات پیش خدمت عالی کی جاسکتی ہیں' لیکن مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے ان پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ جن حضرات کو مزید آیات درکار ہوں وہ کتاب ''قرآن فہمی کے قرآنی اصول'' ملاحظہ فرمالیں۔ اس میں وہ آیات درج کی گئی ہیں۔

ہمارے علماء کرام حضور ﷺ کے نطق کو مطلقاً وحی صرف اس لئے قرار دیتے ہیں کہ اس سے ان کے نزدیک حدیث وحی خفی ثابت ہوجاتی ہے' لیکن اس طرح حضور ﷺ کے اقوال و افعال ان کے خود اختیاری نہیں رہتے۔ اس مضمون میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ حضور ﷺ کے افعال واقوال ان کے خود اختیاری تھے' اس کے ثبوت کے لئے چند عقلی دلائل بھی پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

1- جب مشرکین مکہ حضور ﷺ کی دعوت کو برابر جھٹلاتے رہے تو حضور ﷺ نے اتمام حجت کے طور پر ان سے کہا:

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَى وَفُرَادَى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا (34:46)-

اے رسول تم ان سے کہہ دو کہ تم کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ تم ایک ایک دو دو کھڑے ہو جاؤ اور اچھی طرح غور کرو۔

جب حضور ﷺ اپنے مخالفین کو غور وفکر کی دعوت دے رہے تھے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خود غور وفکر نہ فرماتے ہوں۔ اگر بقول علماء کرام کے قرآنِ کریم اور احادیث نبویہ دونوں وحی الٰہی ہیں تو پھر حضور ﷺ کے غور وفکر کے خود اختیاری اقوال کون سے باقی رہ جاتے ہیں۔

2- قرآنِ کریم میں ارشادِ عالی ہے:

قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (12:108)-

ان سے کہہ دو کہ میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں خدا کی طرف بلاتا ہوں' میں اور میرے پیرو' دونوں مضبوط دلائل کے ساتھ۔

علم وبصیرت کی رو سے دین کو پیش کرنا اور دلیل و برہان کی رو سے اسے ماننا' یہ حکم خداوندی اور سنت نبوی ہے اور تمام مومنین کا بھی یہی شیوہ ہونا چاہئے دین کی دعوت دینے میں جو شخص اس طریقہ کو اختیار نہیں کرتا' وہ حکم الٰہی اور سنتِ نبوی دونوں سے انحراف کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کے دلائل اپنے غور وفکر کے خود اختیاری نتائج ہوتے تھے۔

3- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

إِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحاً طَوِیْلاً (73:7)-

اللہ دن میں تمہیں بہت کام دیتا ہے۔

اس کے ذیل میں مولانا عثمانی نے لکھا ہے کہ:

''یعنی دن میں لوگوں کو سمجھانا اور دوسرے کئی طرح کے مشاغل رہتے تھے۔''

ظاہر ہے کہ حضورﷺ جو سمجھاتے ہوں گے وہ ان کے ذاتی فکر کے نتائج تھے۔

4- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

ادْعُ إِلَی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ (16:125)-

اے رسول تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعے سے بلاؤ اور بحث ومباحثہ کرو بھی تو ایسے طریقے سے جو سب سے اچھا ہو۔

آیہ کریمہ کے ذیل میں بہت ہی عمدہ وضاحت تحریر کی گئی ہے' وہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

''خود پیغمبر علیہ السلام کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ لوگوں کو راستہ پر کس طرح لانا چاہئے۔ اس کے تین طریقے بتلائے۔ حکمت' موعظتِ حسنہ' جدال بالتی ھی احسن۔ حکمت سے مراد یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اٹل مضامین مضبوط دلائل و براہین کی روشنی میں حکیمانہ انداز سے پیش کئے جائیں۔ جن کو سن کر فہم و ادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا سکے۔ دنیا کے خیالی فلسفے ان کے سامنے ماند پڑ جائیں اور کسی قسم کی علمی و دماغی ترقیات وحی الٰہی کے بیان کردہ حقائق کا ایک شوشہ تبدیل نہ کر سکیں۔ ''موعظتِ حسنہ'' موثر اور رقت انگیز نصیحتوں سے عبارت ہے جن میں نرم خوئی اور دلسوزی کی روح بھری ہو۔ اخلاص' ہمدردی اور شفقت وحسنِ اخلاق سے خوبصورت اور معتدل پیرایہ میں جو نصیحت کی جاتی ہے بسا اوقات پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہیں۔ مردوں میں جانیں پڑ جاتی ہیں۔ ایک مایوس اور پژمردہ قوم جھرجھری لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ لوگ ترغیب و ترہیب کے مضامین سن کر منزل مقصود کی طرف بیتابانہ دوڑنے لگ جاتے ہیں اور جو زیادہ عالی دماغ اور ذکی و فہیم نہیں ہوتے مگر طلب حق کی چنگاری سینے میں رکھتے ہیں ان میں موثر وعظ و پند سے عمل کی ایسی اسٹیم بھری جاسکتی ہے جو بڑی اونچی عالمانہ تحقیقات کے ذریعے ممکن نہیں۔ ہاں دنیا میں ہمیشہ سے ایک

ایسی جماعت بھی موجود رہی ہے جن کا کام ہر چیز میں الجھنا اور بات بات میں حجتیں نکالنا اور کج بحثی کرنا ہے۔ یہ لوگ نہ حکمت کی باتیں قبول کرتے ہیں نہ وعظ و نصیحت سنتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں بحث و مناظرہ کا بازار گرم ہو۔ بعض اوقات اہل فہم و انصاف اور طالبینِ حق کو بھی شبہات گھیر لیتے ہیں اور بدون بحث کے تسلی نہیں ہوتی اس لئے وجادلھم بالتی ھی احسن فرمادیا کہ اگر ایسا موقع پیش آئے تو بہترین طریقے سے تہذیب، شائستگی، حق شناسی اور انصاف سے بحث کرو۔''

اقتباس طویل ہوگیا۔ لیکن چونکہ یہ وضاحت بہت عمدہ ہے اس لئے اس کو پیش خدمت کر دیا گیا ہے۔ آپ یہ سطور ملاحظہ فرما کر خود اندازہ فرمالیں کہ یہ گفتگو حضورﷺ کی خود اختیاری ہوگی یا وحی خفی کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ اس وضاحت کا ایک ایک لفظ پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ حضورﷺ کی یہ دعوت الی اللہ ان کے اپنے غور و فکر کے نتیجہ میں ہی کامیاب ہوسکتی تھی۔ جس درجہ حضورﷺ اپنی کوشش اور جدوجہد میں غور و فکر سے کام لے کر دعوت الی اللہ دیں گے، اسی درجہ ان کی تبلیغ کامیاب و نتیجہ خیز ہوئی ہوگی۔

ہمارے علماء کرام قرآنِ کریم کے علاوہ حضورﷺ کے تمام اقوال کو وحی خفی مانتے ہیں جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اقوال حضورﷺ کے بالارادہ اقوال نہیں رہتے یہ خلاف قرآن عقیدہ صرف اس لئے وضع کیا گیا تھا تاکہ حدیث کی کتابوں سے حضورﷺ کی اطاعت کا جواز ثابت کر دیا جائے۔ لیکن وحی خفی کے عقیدہ کے باوجود علماء کرام کی یہ حسرت پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ جن کتب احادیث کو ہمارے علماء کرام اقوال رسول کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، حقیقت میں وہ کتب اقوال رسول کا مجموعہ ہیں ہی نہیں وہ تو صرف اقوال منسوب الی الرسول کا مجموعہ ہیں کیونکہ احادیث کے مجموعوں میں جو اقوال جمع کئے گئے وہ حضورﷺ کے اقوال نہیں ہیں بلکہ وہ رواۃ کے الفاظ ہیں، رواۃ کے یہ الفاظ وحی کیسے ہوسکتے ہیں۔ ہمارے پاس جو احادیث ہیں وہ حدیث کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ وہ احادیث کی Definition میں آتی ہی نہیں ہیں کیونکہ راویوں نے حضورﷺ کے اقوال کو خود اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ احادیث روایت باللفظ (Verbation) نہیں ہیں بلکہ روایت بالمعنیٰ (Narrated) ہیں۔ جب یہ الفاظ ہی راویوں کے اپنے ہیں تو یہ حدیث یا وحی خفی کس طرح ہوسکتے ہیں۔ یہ بات کہ موجودہ احادیث روایت بالمعنیٰ کی گئی ہیں اس کے لئے آپ علماء کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائیں، جو محنت سے دستیاب کئے گئے ہیں۔

1- اما الراویة بالمعنی فالخلاف فیھا شھیر ولاکثر علی الجواز۔ (نزھة النظر،

صفحہ 94)۔

جہاں تک روایت بالمعنی کا تعلق ہے تو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے لیکن جمہور کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے۔

2- حافظ ابن رجب نے امام ترمذی کا یہ قول نقل کیا ہے:

اما من اقام الاسناد و حفظه و غير اللفظ فان هذا واسع عند اهل العلم اذالم يتغير المعنى۔ (شرح علل الترمذی' جلد1'ص145)۔

جس راوی نے سند کو اچھی طرح حفظ کیا اور اسے برقرار رکھا' لیکن متن میں الفاظ کی تبدیلی کی تو علماء حدیث کے ہاں اس کی بڑی گنجائش ہے' بشرطیکہ لفظ کی تبدیلی سے مفہوم میں تبدیلی نہ آئے۔

3- امام رازی کہتے ہیں:

يجوز نقل الخبر بالمعنى و هو مذهب الحسن البصرى و ابى حنيفه۔ (توجیہ النظر'ص300)۔

امام حسن بصریؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک راویت بالمعنی کی اجازت ہے۔

4- جریر بن حازم کا بیان ہے:

سمعت الحسن يحدث باحاديث' الاصل واحد و الكلام مختلف۔

میں نے حضرت حسن بصریؒ سے کئی ایسی روایتیں سنیں جن کا مفہوم ایک تھا اور الفاظ مختلف تھے۔

5- ابن عون کہتے ہیں:

كان الحسن و ابراهيم الشعبى ياتون بالحديث على المعانى۔

حسن بصریؒ' ابراہیم نخعی اور شعبی حدیث کی روایت کرتے وقت معنی ومفہوم کو پیش نظر رکھتے تھے۔

6- سفیان کہتے ہیں:

كان عمر بن دينا لحدث بالحديث على المعنى۔

عمر بن دینا حدیث کا معنی ومفہوم بیان کرتے تھے۔

7- حضرت وکیع کہتے ہیں:

ان لم يكن المعنى واسعاً فقد هلك الناس۔

حدیث کی روایت میں اگر مفہوم بیان کرنے کی گنجائش نہ ہو' تو حدیث کے رواۃ کے پاس کوئی راستہ نہیں رہے گا۔

8- امام بیہقیؒ نے جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ نے کہا:

انا قوم عرب نردو الاحاديث فنقدم و نوخر۔ (تدریب الراوی' ج2' ص93)۔

ہم عربوں کو طریقہ یہ ہے کہ باتوں کو دہراتے

رہتے ہیں' اس لئے تقدیم وتاخیر ہوتی رہتی ہے۔

9- امام بیہقیؒ شعیب بن الحجاب سے نقل کرتے ہیں۔ آپ نے کہا:

دخلت انا وعبد ان علی الحسن' نقلنا' یا ابا سعید' الرجل یحدث بالحدیث فیزید فیہ و ینقص منہ۔ قال انما الکذب علی من تعمد ذلک۔

میں اور عبدان حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہم نے آپ سے پوچھا۔ ابوسعید اس راوی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو حدیث روایت کرتے وقت الفاظ میں کمی بیشی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا' اس کا یہ عمل جھوٹ کے زمرہ میں نہیں آتا۔ جھوٹا راوی وہ ہے جو جان بوجھ کر حدیث کے الفاظ میں کمی بیشی کرتا ہے اور اس کے مفہوم کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔

10- ابواویس کہتے ہیں:

مالنا الزھری عن التقدیم والتاخیر فی الحدیث' فقال ان ھذا یجوز فی القران فکیف بہ فی الحدیث؟ اذا اصبت معنی الحدیث فلم تحل بہ حراماً ولم تحرم بہ خلا لاً فلا باس۔

ہم نے محمد بن شہاب الزہری سے حدیث کے الفاظ میں تقدیم وتاخیر کے بارے میں پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا' تقدیم وتاخیر اگر آیات میں جائز ہے تو روایات میں کیوں جائز نہیں۔ اگر آپ کی رسائی حدیث کے صحیح مفہوم تک ہے اور الفاظ کی تبدیلی سے حرام حلال' اور حلال حرام نہیں ہوتا تو ایسی تبدیلی میں کوئی حرج نہیں۔

11- امام شافعی نے 'انزل القرآن علی سبعة احرف فاقروء ماتیسر منہ' کو بنیاد بنا کر اس ضمن میں گفتگو کی ہے' جو آپ کے مشہور ''الرسالہ'' پر صفحہ 274 پر مرقوم ہے۔

''جب اللہ جل شانہٗ نے مخلوق پر کمال مہربانی فرما کر اپنی کتاب کو سات حرفوں میں نازل فرمایا تو اس سے بآسانی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم کا اس طرح (سات حروف میں) نزول تلاوت کرنے والوں کی سہولت کے لئے کیا گیا تھا۔ اگر قرآن سات حرفوں میں نازل ہوا ہے تو دیگر امور میں تو الفاظ کا اختلاف بطریق اولی جائز ہوگا بشرطیکہ معنی ومفہوم تبدیل نہ ہو۔''

امام شافعی حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ آپ کو معلوم کر کے یقیناً حیرت ہوگی کہ صحاح ستہ کے سارے چھ کے چھ جامعین شافعی تھے۔ ان میں سے ایک بھی حنفی یا مالکی نہیں تھا۔ ہمارے علماء کرام حنفی فقہ کی سختی سے

پابندی کرتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ اس معاملہ میں وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ ہم شوافع کے مجموعوں سے استناد نہیں کرتے۔

امام شافعی کا جو اقتباس ہم نے درج کیا ہے' یہ اسی ''الرسالہ'' سے لیا گیا ہے جس میں امام شافعی کے ایک مناظرہ کا تذکرہ بھی لکھا ہے' جو امام صاحب موصوف کا ایک منکر حدیث سے ہوا تھا۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام صاحب موصوف حدیث کے کس درجہ حامی تھے۔ اس اقتباس میں جو دلیل امام صاحب نے دی ہے ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم کا سات قرأتوں میں نازل ہونا درست نہیں ہے لیکن اس اقتباس سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ امام موصوف روایت بالمعنی کو جائز قرار دیتے تھے۔ چونکہ علماء کرام خود قرآن کے سات قرأتوں میں نازل ہونے کے قائل ہیں' اور امام موصوف کا مقام بھی ان کے نزدیک بہت بلند ہے اس لئے ان کے لئے یہ اقتباس ایک دلیل قاطعہ کا درجہ رکھتا ہے' اسی لئے اس کو یہاں پیش کردیا گیا ہے۔

علماء اصول حدیث نے روایت بالمعنی کے عقلی دلائل بھی تحریر کئے ہیں۔

(1) حافظ ابن حجر اپنی تعلیق میں تحریر فرماتے ہیں:

ومن اقوی حججهم الاجماع علی جواز شرح الشریعته بلسانها للعارف به' فاذا جاز الابدل بلغة اخریٰ فجوازہ' باللغة العربیه اولی۔

روایة بالمعنی کے قارئین کے پاس سب سے زیادہ مضبوط اور ٹھوس دلیل یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی تعبیر و تشریح دوسری زبانوں میں بالاتفاق جائز ہے۔ اگر عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں شریعت کی تشریح وتفسیر جائز ہے تو عربی زبان میں متبادل الفاظ کا سہارا لے کر مفہوم بیان کرنے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے۔

(2) روایت بالمعنی کے جواز میں علماء حدیث دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے اپنے دور میں مختلف علاقوں میں وہاں کے لوگوں کو سمجھانے کے لئے اپنے نمائندوں کو بھیجا تھا۔ یہ نمائندے (اولی الامر) آپ کی روایات اور احکام اپنے الفاظ میں' اپنے انداز اور اسلوب میں وہاں کے عوام کو پہنچاتے تھے۔ یہ عمل دورِ رسالت میں متداول وجاری تھا۔

(3) یہی حال خطبات اور واقعات کا ہے۔ جنہیں مختلف رواۃ نے مختلف الفاظ میں روایت کیا ہے۔ یہ بات اس چیز کی دلیل ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے۔ (المستصفیٰ' جلدا' ص149)۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے آپ نے غور فرمالیا ہوگا کہ ہمارے علماء اصول حدیث نے روایت بالمعنی کو جائز قرار دیا ہے اور احادیث کے یہ مجموعے روایت بالمعنی ہیں

جن میں الفاظ رواۃ کے ہیں۔ یہ اقوال رسول ہرگز نہیں ہیں بلکہ یہ اقوال منسوب الی الرسول ہیں۔

یہ بات کہ روایات میں کتنا حصہ روایت باللفظ کا ہے اور کتنا حصہ روایت بالمعنی کا ہے' اس کی وضاحت معروف عالم دین' مفسر قرآن' جناب امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب ''مبادی تدبر قرآن'' میں خود کردی ہے جبکہ انہوں نے تحریر فرمایا: ''اگران بیان کرنے والوں پر یہ قید عائد کردی جاتی کہ حضورﷺ کے فرمان انؐ کے اپنے الفاظ میں روایت کریں۔یعنی روایت باللفظ ہو' تو میرا خیال ہے کہ علم نبی کا پچانوے فیصد حصہ غائب ہوجاتا۔

ان مندرجہ بالا حوالہ جات اور حضرت مولانا اصلاحی صاحب کی توضیح کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ علماء کرام کے خود اپنے موقف کے مطابق ہماری احادیث کا 95 فیصد حصہ رواۃ کے اپنے الفاظ پر مشتمل ہے' جو کسی حال میں حضورﷺ کے الفاظ نہیں ہو سکتے نطق رسول تو ایک طرف رہا' یہ تو اقوال رسول بھی نہیں ہیں۔ یہ سراسر راویوں کے الفاظ ہیں۔اس لئے نہ تو یہ دینکا حصہ ہیں' نہ ہی ان سے اطاعت رسول ہوتی ہے۔ان کا صحیح مقام صرف دین کی تاریخ ہےاوربس۔

فان ابی ووالدتی و عرضی
لعرض محمد منکم وقاء۔

(حضرت حسان رضی اللہ عنہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

اللہ و رسول ﷺ کی اصطلاح

قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ حکومت یا اطاعت صرف خدا کی ہے۔ اس کے سوا کسی کی نہیں۔ یہی الدین کی لم ہے۔ یہی اسلام کی غایت ہے۔۔ یہی توحید ہے۔ یہی خدا پر ایمان کا مقصدِ اولین ہے۔۔۔لیکن خدا کی ذات تو ایسی ہے کہ اس کا محسوس اور مرئی طور پر ہمارے سامنے آنا تو ایک طرف وہ ہمارے قیاس وخیال، گمان و وہم سے بھی ماوراء ہے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کیسے کی جائے۔ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ میں نے اپنی کتاب تمہاری طرف نازل کر دی ہے۔ اس کتاب کی اطاعت یا محکومیت، میری اطاعت یا محکومیت ہوگی۔

اگر اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہوتا تو ہر شخص اپنے اپنے طور پر کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت کر لیتا۔ لیکن اسلام تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اس لئے کتاب اللہ کی اطاعت، اجتماعی نظام کی رو سے کی جا سکتی ہے۔ اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا خدا کی اطاعت کی عملی شکل اس مملکت یا حکومت کی اطاعت ہوگی جو قرآن مجید کے احکام واصول واقدار کے نافذ کرنے کے لئے قائم کی جائے۔

اس قسم کی پہلی حکومت، حضور نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمائی تھی، اور خود حضور ﷺ اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی تھے۔ اس بنا پر اس مرکزی اتھارٹی (رسول ﷺ) کی اطاعت درحقیقت کتاب اللہ کی اطاعت یا، بالفاظ دیگر خدا کی اطاعت تھی۔ اس کے لئے قرآن کریم نے ''اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے مراد ہے اس نظامِ خداوندی کی اطاعت، جسے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا۔ چونکہ اطاعتِ خداوندی کے اس نظام کو حضور نبی اکرم ﷺ کے بعد بھی قائم رہنا تھا۔ اس لئے اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کا عملی مفہوم اس نظام کی اطاعت تھا۔ اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کو ''مرکزِ ملت'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

یہ حقیقت کہ اللہ اور رسول ﷺ سے مرکزِ ملت (یا

نظامِ خداوندی یا اسلامی مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ) مراد ہے' قرآن کریم میں واضح الفاظ میں اور اس شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کے لئے قرآن مجید سے بکثرت شہادات پیش کی جاسکتی ہیں' لیکن یہاں چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً جنگِ احد میں جب مسلمانوں کی فوج میں خلفشار پیدا ہوگیا اور حضورﷺ تنہا رہ گئے تو آپﷺ نے ان بکھرے ہوئے پروانوں کو آواز دی۔ اس آواز پر وہ سب پھر اس شمع کے گرد جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز نبی اکرمﷺ نے دی تھی لیکن چونکہ یہ بلاوا حضورﷺ کا ذاتی بلاوا نہ تھا' بلکہ آپﷺ نے بہ حیثیت سربراہِ مملکت یہ آواز دی تھی' اس لئے اس آواز کو خدا اور رسولﷺ کی آواز قرار دیا گیا:

الَّذِيْنَ اسْتَجَابُواْ لِلّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُواْ مِنْهُمْ وَاتَّقَواْ أَجْرٌ عَظِيْمٌo(3:172)-

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا (اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے) باوجودیکہ (اس سے ذرا ہی پہلے وہ) زخم کھا چکے تھے' سو یاد رکھو ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں' یقیناً ان کے لئے (اللہ کے حضور) بہت بڑا اجر ہے۔

2- یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے نبی اکرمﷺ سے استوار کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو ''خدا اور رسول'' کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے' اس لئے کہ یہ مخالفت نظامِ اسلامی کی مخالفت تھی:

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَن يُشَاقِّ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِo(59:4)-

یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے ''اللہ اور اس کے رسولﷺ'' کی مخالفت کی ہے' اور جو کوئی اللہ (کے حکم) کی مخالفت کرتا ہے تو (یاد رکھو) اللہ کا قانون (پاداشِ عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے۔

3- نظامِ اسلامی کے خلاف بغاوت کر کے فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں:

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِيْ الأَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِيْ الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِيْ الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌo(5:33)-

بلاشبہ ان لوگوں کی جو ''اللہ اور اس کے رسولﷺ'' کے خلاف جنگ کرتے ہیں' اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں

یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں' یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں' یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے (یعنی جیسی کچھ سزا ان کے لئے ضروری ہو انہیں دی جائے) یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذابِ عظیم ہے۔

4- یہاں تو ''اللہ اور رسول'' کے خلاف جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ سورہ احزاب میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًاo(33:57)-

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولﷺ کو اذیت پہنچاتے ہیں ان کے لئے دنیا اور آخرت میں ذلت آمیز عذاب ہے اور خدا کی لعنت''۔

اس آیت میں اگر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ اور رسولﷺ سے مراد رسول اللہﷺ کی ذات لی جائے تو اس سے بڑی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ رسول اللہﷺ کو اذیت پہنچانے کی بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے' کیونکہ آپﷺ ایک انسان (بشر) تھے اور ایک انسان (یا انسانوں کا گروہ) دوسرے انسانوں کو اذیت پہنچا سکتا ہے (رسول اللہﷺ کو اذیت پہنچانے کا ذکر قرآن مجید کے کئی مقامات میں آیا ہے) لیکن اللہ کو اذیت پہنچانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے کون اذیت پہنچا سکتا ہے؟ اس لئے اس آیت میں ''اللہ اور اس کے رسولﷺ'' کو اذیت پہنچانے سے مقصد و مطلب نظامِ خداوندی کو نقصان پہنچانا ہے۔

ان تشریحات کی روشنی میں آیت (4:59) کی طرف آیئے جس کے ''سوچے سمجھے سازشی'' مروجہ مفہوم کے ذریعے سگنل تبدیل کر کے **الدین** کی گاڑی غلط پٹڑی (مذہب) پر ڈالی گئی۔ جوں جوں زمانہ (وقت) گزرتا جا رہا ہے ان دو پٹڑیوں کے درمیان فاصلہ بھی اسی قدر بڑھتا جا رہا ہے! اسی قدر مسلمان **الدین** سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

حکومت کوئی بھی ہو اس میں ایک تو اس کی مرکزی اتھارٹی (سنٹرل گورنمنٹ) ہوتی ہے اور دوسرے اس کے افسرانِ ماتحت (عمالِ حکومت)۔ آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ.

یعنی اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی بھی اطاعت کرو' اور اس کے افسرانِ ماتحت کی بھی۔

اس کے بعد ہے:

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ.

اگر تم میں اوران افسرانِ ماتحت میں اختلاف ہو جائے تو اس معاملہ کے تصفیہ کے لئے مرکزی اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرو۔

پوری آیت کا مفہوم حسبِ ذیل ہوگا:

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ تم اس نظام کی پوری پوری اطاعت کرو' جسے قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے' رسول نے قائم کیا ہے اور اس نظام کے مرکز کے مقرر کردہ نمائندگانِ حکومت (افسران ماتحت) کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان افسرانِ ماتحت میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے' تو اس کے لئے مرکز کی طرف رجوع کرو۔۔ یعنی افسرانِ ماتحت کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کرو' جو اس تنازعہ کا قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلہ کر دے گی۔ (5:48, 42:10)-

مرکزی اتھارٹی کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی۔ اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا اور چونکہ وہ فیصلہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوگا' جس پر تم ایمان رکھتے ہو' اس لئے اس فیصلہ کو بطیبِ خاطر تسلیم کرو۔ اس کے خلاف دل میں بھی گرانی محسوس نہ کرو۔ (4:65)-

یہ شہادت ہوگی اس بات کی کہ تم واقعی خدا کے ضابطہ ہدایت' اور قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ اخروی پر یقین رکھتے ہو۔ یہ روش نہایت عمدہ اور انجام کار معاشرہ کا صحیح صحیح توازن قائم رکھنے کا موجب ہوگی:

إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاًo (4:59)-

صحیح بخاری

جلد 6 حدیث نمبر 108 جس کے راوی ابن عباس ہیں' میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب عبداللہ ''بن حدیفہ'' بن قیس'' بن عدی'' کوایک فوج کا کمانڈر مقرر کیا تو آیت (4:59) ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور افسرانِ ماتحت کی نازل ہوئی۔''

جب تک اسلامی نظامِ حکومت قائم رہا' اس آیت کا یہی مفہوم لیا جاتا رہا۔ حضور ﷺ نے جو فرمایا تھا کہ ''تم پر میری اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنت کا اتباع لازمی ہے''۔ تو اس سے یہی مراد تھی۔ خلفائے راشدین کی پہلے سے ہی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔ جب تک اسلامی نظام قائم رہا' اس کے سربراہ خلفائے راشدین کے لقب سے سرفراز رہے۔ یہ سوءِ اتفاق ہے' اور امت کی حرمان نصیبی کہ یہ سلسلہ معدودے چند تک قائم رہا۔

بعد میں کیا ہوا؟

بعد میں جب یہ نظام' ملوکیت میں بدل گیا تو اس آیت کے مفہوم میں دشواری پیش آ گئی۔ نظامِ ملوکیت میں'

امت میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ دنیاوی امور' حکومت کی تحویل میں آ گئے اور امورِ شریعت' علماء کی تحویل میں۔ اس ثنویت کی رو سے' اس آیت کے معنی یہ کئے گئے کہ تم اطاعت کرو اللہ کی۔ اور اطاعت کرو اس کے رسولﷺ کی اور اربابِ حکومت (اولی الامر منکم) کی اگر تم میں اور حکومت میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس اختلاف کے رفع کرنے کے لئے حضرات علماء کرام کی طرف رجوع کرو تاکہ وہ تمہیں بتائیں کہ اس باب میں اللہ اور اس کے رسولﷺ کا کیا حکم ہے۔ علماء کا فیصلہ تمہارے (عوام) اور حکومت دونوں کے لئے قولِ فیصل ہوگا۔

تھیا کریسی

بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ اس سے آخری اقتدار' مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آ گیا' اور چونکہ وہ اپنے فیصلے کو ''اپنا فیصلہ'' قرار نہیں دیتے تھے' بلکہ اسے ''خدا اور رسولﷺ کا فیصلہ'' کہہ کر صادر کرتے تھے۔ اس لئے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے سرتابی کر سکے۔ عوام کا بے پناہ ہجوم (خدا اور رسول کے نام پر مٹنے کے لئے) ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس سے ایسی تھیا کریسی وجود میں آ گئی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ ہماری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ان حضرات (مذہبی پیشوائیت) نے کسی حکومت کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ جب تک حکومت ان کے ساتھ سازباز رکھتی' یہ اس کے ہر فیصلے کو خدا اور رسولﷺ کا فیصلہ قرار دیتے۔ جونہی اس سے کوئی اختلاف ہوتا' یہ خدا اور رسولﷺ کے نام پر عوام کو اس کے خلاف اٹھ کھڑا کرتے۔ یہی کچھ آج تک ہو رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المعارج

(آیات29 تا اختتام)

عزیزانِ من! آج دسمبر 1983ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المعارج کی آیت 29 سے ہو رہا ہے: (70:29)۔

قرآن کے معاشی نظام میں ضرورت سے زیادہ ملکیت کی اجازت ہی نہیں

سابقہ آیات میں قرآنِ کریم کے معاشی نظام کا ایک گوشہ سامنے آیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ جن لوگوں کے پاس اپنی ضروریات سے زائد ہو وہ ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو جاتا۔ اس میں ان لوگوں کا بھی حق ہوتا ہے‘ وہ لوگ اس سے بطور اپنا حق لے سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ضروریات اپنی محنت سے پوری نہ ہوتی ہوں یا وہ محنت کرنے کی استعداد سے ہی محروم ہو چکے ہوں۔ انہیں مسکین اور محتاج کہا جاتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پیشتر میں یہ عرض کردوں کہ جب کبھی بھی اسلام کے معاشی نظام کا ذکر آتا ہے تو عام طور پر ہی نہیں بلکہ خاص طور پر نوجوان طبقہ کے افراد آتے ہیں۔ وہ یہ بات سن کر کہتے ہیں کہ یہی تو کمیونسٹ کہتے ہیں۔ آپ کمیونزم کے اتنے خلاف ہیں اور قرآن کا وہی نظام پیش کرتے ہیں۔

کمیونزم والوں نے خود کمیونزم کا مطالعہ نہیں کیا

اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ جو کمیونزم یا کمیونسٹ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں خود انہیں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کمیونزم ہے کیا۔ ہمارے ہاں تو علم کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ چند الفاظ ہوتے ہیں جو لوگوں نے یاد کر رکھے ہوتے ہیں۔ بڑے ہوں یا چھوٹے‘ اہلِ دانش و بینش ہوں یا عوام‘ کیفیت سب کی یہی ہے۔ میں نے تو دیکھا ہے کہ جو کمیونزم کے بڑے بڑے مدعی ہیں انہوں نے بھی بہت کم کمیونزم کا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اتنی گنجائش تو نہیں کہ میں تفصیل سے بتا سکوں کہ یہ کیا ہے‘ پھر بھی مختصراً کہتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ مارکس (Karl Marx: 1818-1883) نظامِ سرمایہ داری کے

خلاف تھا۔ یہ نظامِ سرمایہ داری (Capitalism) ایک تخریبی چیز ہے اور انسانیت کے خلاف ہے۔ خدا کے نظام میں تعمیری بات آگے چلنی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ معاشی نظام ہے کیا جو تعمیرِ انسانیت کا ضامن بنتا ہے۔ کارل مارکس نے جو اصول دیا تھا وہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور اسے اس کی ضروریات پورا کرنے کے لیے دیا جائے۔ یہ بڑا زرّیں اصول ہے۔ یہ اصول اس کا اپنا اختراع کیا ہوا نہیں تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ اصول نافذ فرمایا تھا اور اس پہ عمل کر کے بھی دکھایا ہے۔ یہ تو وہاں کا اصول ہے۔

مارکس کے پاس کوئی جذبہ محرکہ نہ تھا

عزیزانِ من! کارل مارکس (Karl Marx: 1818-1883) نے اس اصول کو نظری طور پہ پیش کیا تھا۔ وہ شخص حقائق کو سامنے رکھتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس پر عمل کرانے کے لیے کوئی بنیاد نہیں مل سکتی کہ ایک شخص جان مار کر مسلسل محنت کرے اور اس میں سے صرف اتنا سا لے جتنا سا دو روٹیاں اس کو ضرورت ہے اور باقی سب دوسروں کو دیدے۔ سوال یہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا چلا جائے۔ اسے اس ''کیوں'' کا جواب نہیں مل سکتا تھا تو انہوں نے یہ طے کیا کہ چونکہ کمیونزم تو ممکن العمل نہیں ہے اس لیے اس سے نچلے درجے پر جو سوشلزم ہے' اسے ہی سر دست اختیار کر لیا جائے۔ اگرچہ انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ اس گردشِ دوراں کے بعد ایک دور آئے گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ دَور کب آئے۔ لیکن آخرالامر انسانوں نے آنا اسی پہ ہے۔ اس لیے سرِ دست ہم اسے تو نافذ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس سے نیچے درجے پر سوشلزم ہے لہٰذا سرِ دست اسے ہی اختیار کیا جائے جب کہ سوشلزم دنیا کا بدترین نظام ہے۔ کیپٹلزم (نظامِ سرمایہ داری) میں ذرائع پیداوار اور دولت جو زائد ہو وہ مختلف افراد کے ہاتھوں میں رہتی ہے مگر سوشلزم میں یہ اسٹیٹ یا مملکت کے پاس چلی جاتی ہے۔

مملکت کی تعریف

عزیزانِ من! ریاست یا مملکت تو Abstract (غیر محسوس' نظری سے) الفاظ ہیں۔ جب ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو کہ یہ کس کے پاس چلی جاتی ہے۔ اسٹیٹ کوئی مائی (عورت) تو نہیں بیٹھی ہوئی کہ جسے جا کر یہ کچھ دیدیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جن کے ہاتھوں میں اقتدار ہوتا ہے انہی کا نام اسٹیٹ ہوتا ہے۔ یہ ان کے ہاتھوں میں دیدیا جائے۔ آپ سوچیے کہ سیرت و کردار کے اعتبار سے انسان تو وہی ہوں جیسے ہم لوگ ہیں یا جیسے دنیا میں ہیں۔ ان کے پاس پہلے ہی فوج بھی ہو' پولیس بھی ہو' قانون سازی کے اختیارات بھی ہوں' جیل خانے بھی ہوں' ہنٹر بھی ہوں' موت کے لیے پھانسی گھر بھی ہوں' یہ سارا کچھ پہلے سے موجود ہو' اور سارے ذرائع

پیداوار اور دولت بھی انہی کو دیدی جائے تو آپ سوچیے کہ اس کے بعد وہ کس قسم کی فرعونیت کا نظام بن جائے گا۔ اسے سوشلزم کہتے ہیں۔ یہ نظام چل ہی نہیں سکتا تھا۔

دنیا کا بدترین نظام

روس میں بھی یہ نظام ناکام رہا' چین میں بھی ناکام ہوگیا۔ سوال یہ ہے کہ اس میں بنیادی کمزوری کیا تھی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ نظام کے یہ الفاظ' قانون کے یہ الفاظ' دہرا دینے سے یا کاغذوں پہ لکھ دینے سے' وہ نظام قائم ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا۔ بات کچھ اور ہے۔

کمیونزم کے پاس کوئی ضابطہ قوانین نہیں

قرآن نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ انسانوں نے یہ سارا کچھ کرنا ہے۔ قرآن نے کہا کہ بات یہ دیکھنی ہے کہ وہ انسان کیسے ہوتے ہیں جو اس نظام کو چلاتے ہیں۔ اس کے لیے وہ پہلے انسانیت سازی کرتا ہے' پہلے وہ انسان بناتا ہے اور پھر ان کے ہاتھ میں یہ چیزیں دیتا ہے لیکن ان کے ہاں کمیونزم میں تو کوئی ضابطہ قوانین ایسا ہے ہی نہیں جو انسانوں سے بالا ہو۔ وہ نہ خدا کو مانتے ہیں' نہ وحی کو مانتے ہیں' نہ ضابطہ اخلاق کو مانتے ہیں' نہ Permanent Values (مستقل اقدار) کو مانتے ہیں۔ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں مانتے ہیں۔ اس وقت اور زیادہ تفصیل میں تو نہیں جا سکتا۔ لیکن لینن (Vladimir Illich Lenin:1870-1924, also Lenin as Nikolai Lenin) نے 1920ء میں یوتھ کمیونسٹ لیگ کی کانگرس میں نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا وہ اس لینن (1870-1924ء) کے ہاں نہیں ہے۔ ان کے ہاں کمیونزم میں ہر جگہ یہ ملے گی کہ ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی فوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ پہلی چیز ہی یہ ہوگئی کہ تمام ضوابطِ اخلاق جو کسی سپر ہیومن سرچشمہ سے' کسی فوق البشر سرچشمہ یعنی وحی سے ہو' ہم اس کو مسترد کرتے ہیں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے' دھوکا ہے۔ یہ تصور زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطہ اخلاق محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطہ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ جب کہ اس کے برعکس سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطہ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ اس پر سوشلزم کے مبلغین یہ کہتے ہیں کہ ہم اس تصور کو ٹھکراتے ہیں' ہم خدا وغیرہ کو کچھ نہیں جانتے' ہم خدا کو مانتے ہی نہیں' ہمارا تصور یہ ہے کہ اخلاق انسانی معاشرے کا ہی نام ہے' اس سے ماورا جو کچھ ہے فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے مطابق جس قدر افسانے وضع کیے گئے ہیں ہم ان کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔ اب یہ ہے انسان کے متعلق ان کا

نظریہ: کوئی مستقل اقدار نہیں' کوئی اس قسم کا غیر متبدل ضابطہ اخلاق نہیں' انسانوں سے اونچا کوئی سر چشمہ ایسا نہیں' جہاں سے ہدایت یا قانون یا راہنمائی ملتی ہو' خود ہی ہم جس قسم کے قوانین بنائیں وہی قوانین ہیں کہ جن کے تابع نظام چلے گا۔ انسانوں کے اندر تبدیلی پیدا کرنے والی بات ضابطہ اخلاق کی رو سے ہوتی ہے اور وہ کسی غیر متبدل ضابطہ اخلاق کے ماننے والے ہی نہیں ہیں۔

سوچیے کہ پھر دنیا کا حشر کیا ہوگا

عزیزانِ من! اس کمیونزم کے نظام کی بنیادی یہ کمزوری تھی کہ انسانوں کے اندر کوئی تبدیلی نہ پیدا کی جائے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ محض قانون کے الفاظ کی بنیاد پر اس قسم کا نظام قائم کر دیا جائے تو یہ کچھ ہو جائے گا۔ اب وہ نظام جس میں پہلے سے ہی' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' اتنی قوتیں اور اقتدارات انسانوں کے ہاتھوں میں ہوں' انہیں تمام دولت اور ذرائع پیداوار کا مالک بھی بنا دیا جائے' اس ایک ٹولے' گروہ' جماعت' جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے یا جس نے کسی طرح سے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور یہ سب کچھ بھی اس کے ہاتھ میں آ جائے' تو پھر آپ سوچیے کہ دنیا کا حشر کیا ہوگا۔ آپ جتنے زیادہ اختیارات انسان کو دیتے جائیں گے اور ان پر کسی قسم کی کوئی Controlling Authority (مرکزی اتھارٹی برائے کنٹرول) نہیں ہوگی۔ وہ اتنا ہی زیادہ فرعون [1] بنتا چلا جائے گا۔

یہ ہے وہ وجہ جس سے یہ نظام کامیاب ہو ہی نہیں سکتا ہو۔

یہ بنیاد صرف قرآن کے پاس ہے

عزیزانِ من! اقبالؒ (1877-1938) نے' بہت پہلے جب کمیونزم کا چرچا ہوا' یا انقلاب آیا ہے' اس زمانے میں کہا تھا کہ

اے کہ مے جوئی نظامِ عالمے

اے کہ تو ایک عالمگیر معاشی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ انہوں نے روس سے کہا تھا کہ......

جستہ ای اورا اساسِ محکمے

کیا اس کے لیے تم نے وہ بنیاد تلاش کر لی ہے جس پر اس کی اتنی بڑی عظیم عمارت کھڑی ہو سکے؟ اور پھر انہوں نے بتایا تھا کہ یہ اساس' یہ بنیاد' قرآن کے سوا کوئی تیسری چیز نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہاں تو ضمناً ایک اقتباس دیا ہے اور چند باتیں عرض کی ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''نظامِ ربوبیت'' میں نظامِ سرمایہ داری اور رشیا (روس) کے اس نظام کی اصل حقیقت بتائی ہے اور قرآن کے معاشی نظام کی

---

[1] اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' (فٹ نوٹ نمبر 1)۔

بنیاد یہ دی ہے کہ قرآن انسانوں کے اندر پہلے تبدیلی پیدا کرتا ہے اور جب وہ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے ہاتھوں میں اقتدار دیتا ہے۔اس تبدیلی کی ایک جھلک ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ❶ (59:9) وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پہ ترجیح دیتے ہیں۔ یہ مومن کی ایک خصوصیت بتائی ہے۔یہی جماعتِ مومنین کی خصوصیت ہے۔آپ ذرا اس کو ذہن میں رکھیے تو نظر آئے گا کہ یہ کتنا عجیب انقلاب ہے‘ ورنہ ہر انسان‘ ہر شخص‘ ہر ذی حیات‘ اپنی ضرورت کو مقدم سمجھتا ہے۔

ایک تو یہ نقشہ ہے کہ کسی دوسرے کی ضرورت کو کوئی سمجھے ہی نہیں‘ اسے اس کا احساس ہی نہ ہو۔ یہ حیوانات کا درجہ ہے۔اگر وہ سمجھے گا بھی تو زیادہ سے زیادہ یہ صورت ہوگی کہ اپنے آپ کو پہلے مقدم سمجھے گا اور اس کے بعد دوسرے کا خیال آئے گا۔

قرآن ایک درجہ آگے جاتا ہے

عزیزانِ من! قرآن تو ایک درجہ آگے جاتا ہے۔وہ ایسے انسان تیار کرتا ہے کہ جب وہ اپنی اور کسی دوسرے کی ضروریات میں تقابل کریں اور محسوس کریں کہ اس کی ضرورت میری ضرورت سے زیادہ ہے تو اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیں‘ آپ محروم رہیں اور اسے دیدیں۔ یہ باتیں ہمیں تو آج محض وعظ اور افسانے سے نظر آتے ہیں۔ٹھیک ہے کہ ہم نے نہ ایسے مومن دیکھے‘ نہ ہم ایسے مومن بنے۔

نفسا نفسی کی بنیادی وجہ

قرآن جو بنیاد قائم کرتا ہے وہ انسانوں کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے اور جب یہ اس قسم کے انسان وجود میں آجائیں تو یہ زمین‘ یہ دولت اور اسی قبیل کی یہ دوسری چیزیں تو ایک طرف رہیں‘ اگر ان کے ہاتھ میں پوری کائنات بھی دیدی جائے گی تو بھی اس سے بدنظمی کا کوئی واقعہ نہیں ہوگا۔وہ فرعون نہیں بنیں گے بلکہ قوانین خداوندی کے سامنے اور زیادہ جھکتے چلے جائیں گے‘ اس وقت جو دنیا میں نفسا نفسی کی ایک قیامت برپا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آج ایسے انسان نہیں ہیں۔

---

❶ یہ ہمیشہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں‘ خواہ انہیں خود تنگی ہی سے گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ (یہی سچے مومنین کا شعار ہے۔)(مفہوم القرآن۔پرویز)

آبادی تو بڑھ رہی ہے لیکن انسان کم ہوتے جا رہے ہیں

عزیزانِ من! اس نفسانفسی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ساری نگاہیں قوانین کے اوپر رہتی ہیں' الفاظ اور اصطلاحات پر رہتی ہیں' فارملزم (رسمی چیزوں Formalism:) پہ رہتی ہیں' رسومات پہ رہتی ہیں۔ جو مقصدِ حیات ہے' جو انسانیت کے اندر تبدیلی پیدا ہونی ہے' اس کا خیال کہیں بھی نہیں آ رہا۔ انسانوں کی آبادی تو بڑھتی چلی جا رہی ہے مگر ''انسان'' کم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اب تو شاید نایاب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ قرآن پہلے انسانوں کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے اور جب وہ تبدیلی پیدا ہو چکتی ہے تو ان انسانوں کے ہاتھ میں اقتدار دیتا ہے۔ اس کے بعد تو کسی قسم کے خطرے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہے۔ کیا ان انسانوں سے کسی کو خطرہ ہوگا؟ نہیں قطعاً نہیں۔ سابقہ آیات میں یہی چیز آئی تھی کہ مصلین وہ ہیں جن کی کمائی میں' جن کی دولت میں' جن کی آمدنی میں' جن کے ذرائع میں' حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ❶ (70:24-25) ہے۔ وہ خیرات (Charity) کے طور پر نہیں اور نہ ہی دیان گیان کے طور پر دوسروں کو کچھ دیتے ہیں وہ تو اپنی کمائی کے اندر ان کا حق سمجھتے ہیں جن کی ضروریات رُکی ہوئی ہوں۔ اس نے یہ کہا تھا کہ یہ ہوتے ہیں جنہیں آپ مصلین کہتے ہیں۔ صلوٰۃ ان انسانوں کے اندر یہ تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ تو قرآن نے یہ اصول بتایا کہ ان کی کمائی میں حق ہوتا ہے اور اسے حقِ معلوم کہا ہے۔ یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے' ہر ایک کو اس کا علم ہوتا ہے۔ تو یہ ذہن میں رکھتے ہوئے یا ہمیں سمجھانے کے لیے کہا گیا ہے کہ اس قسم کا نظام ہوتا ہے جس میں ہر ضرورت مند کی ضرورت کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔

قرآن محض قانون نہیں بتاتا' انسان بھی بناتا ہے

عزیزانِ من! آگے یہی بات تھی کہ پھر وہ انسان کس قسم کے ہوتے ہیں۔ اگلی ہی آیت میں یہ بات بتادی کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ انسان کیسے ہوتے ہیں۔ یہ ہے قرآن! اس نے محض قانون نہیں بتایا' نظام کے خطوط نہیں سامنے لایا' صرف لائنز ہی نہیں کھینچیں' اس نے بتایا ہے کہ وہ انسان کیسے ہوتے ہیں۔ میں یہاں ان انسانوں کی موٹی موٹی دو چار خصوصیات بیان کروں گا' یاد رکھیے! قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ وہی ہیں جن کے اندر پہلے انسان یہ تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ جن انسانوں کے اندر یہ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں' قرآن انہیں اس پروگرام کو بروئے کار لانے کا اہل قرار دیتا ہے۔ وہ اقتدار ان کے ہاتھ میں دیتا

---

❶ ایسا حق ہے جس کا سب کو علم ہے۔ یہ حق ان لوگوں کا ہے جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہ ہوتی ہوں' یا جو کمانے کے قابل نہ رہیں اور اس طرح اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں۔ اس لیے وہ ان کا حق انہیں لوٹا دیتے ہیں اور اپنی ضروریات سے زائد اپنے پاس کچھ رکھتے ہی نہیں۔ (2:219) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے۔ کسی انسان کا کسی دوسرے انسان پہ حکومت کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ یہ تو قرآن کی رو سے ہوتا ہی نہیں لیکن کسی کے حکم منوانے کا بھی یہ اختیار دینا' خواہ وہ خدا کا حکم ہو' کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ دونوں انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔ قرآن تو کرتا یہ ہے کہ پہلے انسانوں کے اندر یہ تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یہاں بتایا کہ ہم نے یہ کہا ہے کہ وہ مصلین اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اب ان کی دو چار خصوصیات بھی سن لیجیے۔

معاشی نظام کے ساتھ جنسیات کا تعلق

عزیزانِ من! سب سے پہلی خصوصیت وہ ہے جس کے متعلق عام طور پہ سمجھا ہی نہیں جاتا کہ اس کا بھی کوئی تعلق معیشت سے یا نظامِ سیاست سے ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ o اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ o فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ [1] (23:5-7)۔ اس نے پہلی چیز جنسیات (Sex) کے متعلق بتائی ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' عام طور پر ذہنوں میں نہیں آتا کہ معاشی نظام کے ساتھ جنسیات کا کیا تعلق ہے۔ ہماری سمجھ میں تو یہ آ ہی نہیں سکتا' اس لیے کہ ہمارے ہاں تو تحقیق کا سوال ہی نہیں ہے۔ کچھ رسوم ہیں جو بلا تنقید چلی آ رہی ہیں۔ صدیوں سے یہ امت انہی پر کارفرما ہے۔ جنسیات کا جو ایک حدود فراموش نظام مغرب کی اقوام کے اندر کچھ عرصے سے رائج ہوا ہے' انہی نے تحقیق شروع کی کہ جنسیات کو ضوابط کے تابع رکھنے اور اس کو بے محابہ آزاد کر دینے میں قوموں کی زندگی پر کیا فرق پڑتا ہے۔

قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کئی ایک درسوں کا مستقل موضوع ہی ''قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر'' قرار دیا تھا اور انہی کے ہاں کے محقق جنہوں نے خاص طور پہ اس مسئلے پہ تحقیق کی ہے' کا تذکرہ کیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے انون (Unwin) [2] کی کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ وہ خود اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر جنسیات کو حدود کے اندر نہ رکھا جائے تو ایسی قوم زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک

---

[1] اور انہوں نے اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھا اور انہیں صرف اپنی بیویوں پر صرف کیا یا ان لونڈیوں پر جو انسدادِ غلامی کے متعلق قرآنی احکام نازل ہونے سے پہلے (47:4) ان کی ملک میں آ چکی تھیں (لیکن جنہیں' نکاح کے بعد بیویوں کا ہم پلہ قرار دیا جا چکا ہے)۔ ان سے زناشوئی کے تعلقات رکھنے پر کوئی ملامت نہیں۔ جو کوئی اس کے علاوہ جنسی تعلق کی کوئی صورت اختیار کرے تو وہ قانون شکنی ہوگی اور حدودِ خداوندی سے تجاوز (جو سنگین جرم ہے۔ 24:2) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن سے 1934ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کا نام ہے Sex and Culture اور اس کے مصنف کا نام ہے۔ J.D. Unwin ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص ص۔ 168-166۔

زندہ رہ سکتی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ یعنی وہاں یہ انفرادی سوال نہیں رہ گیا۔ انہوں نے تحقیق کی ہے کہ وہ قوم ہی تین نسلیں ہیں۔ آپ اسے زیادہ سے زیادہ سو سال کہہ لیجیے۔ اس کے بعد اس سے زیادہ عرصہ تک وہ قوم زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ زندہ نہ رہنے کے معنی ہیں کہ وہ قوم زوال پذیر ہو جاتی ہے' اس کا شمار مردہ اقوام کی صف میں ہونے لگ جاتا ہے۔ یہ صرف جنس کو غیر محدود طریق پر عام کرنے سے ہوتا ہے کہ ایسی قوم زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ قوم رہ سکتی ہے۔ یہ ان کی تحقیق ہے۔ قرآن نے پہلی چیز یہ قرار دی کہ جن کے ہاتھوں سے یہ نظام بروئے کار آئے گا' ان کے اندر پہلی چیز یہ ہے کہ وہ جنسیات کو ان حدود کے اندر رکھیں گے جو قرآنی یا وحی کے ضابطہ اخلاق نے متعین کی ہیں۔ وہ حدود غیر متبدل ہیں اور بتا دیا کہ اس کا طریقہ' نکاح کا طریقہ ہے۔ اب اس کے اندر **ما ملکت ایمانھم** کا بھی ایک لفظ آیا ہوا ہے۔

دوسرا موضوع غلام اور لونڈیاں

عزیزانِ من! مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ ایک دوسرا موضوع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان سے مراد غلام اور لونڈیاں ہیں۔ قرآن کے اندر یہ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ بار بار آیا۔ میں چند الفاظ میں دہرادوں۔ یہ بات تو درس کے اندر کئی دفعہ آ چکی ہے۔ نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے میں' ویسے تو ساری دنیا کے اندر ہی غلامی عام تھی' عربوں میں خاص طور پر بڑی کثرت سے مرد غلام اور عورتیں لونڈیاں ہوتی تھیں' وہ جنگ کے قیدیوں کو بھی اس طرح سے غلام اور لونڈیاں بناتے تھے اور پھر یہ مارکیٹ میں بکتی بھی تھیں' ان کا تبادلہ بھی ہوتا تھا' پھر جو دوسرے ممالک اس سے بھی زیادہ کمزور تھے' یہ وہاں سے اغوا کر کے بھی لے آتے تھے' تو گویا یہ بڑی عام چیز تھی اور معیوب بھی نہیں تھی۔ یہ معاشرے کا ایک جزو بن چکی ہوئی تھی۔

غلام اور لونڈیوں کے متعلق قرآن کے احکام

قرآنِ کریم کے نزول کے زمانے میں ان کی آبادیوں میں ان غلاموں اور لونڈیوں کی اکثریت تھی۔ قرآن نے آکر پہلی چیز تو یہ کی کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کے اس سرچشمے یعنی اس سوچ کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جائے گا' ان کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا۔ اور یہ قرآن ہے عزیزانِ من! کہا کہ اگر انہیں فدیہ دینے کی طاقت نہ ہو' ایسا نہ ہوسکتا ہو' تو انہیں بطورِ احسان چھوڑنا ہوگا۔ بہرحال ان کو چھوڑنا ہوگا۔ یہ تو آئندہ کے لیے ہوا اور جو اس زمانے میں موجود تھے' سارے قرآن میں ان کے متعلق احکام ہیں۔ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ کے یہ معنی ہیں کہ وہ غلام اور لونڈیاں جو اس زمانے میں ابھی تک موجود ہیں۔ اگر ان کو شباشب ہی یہ کہہ دیا جاتا کہ ان سب کو آزاد کر دیجیے' یہ چلے جائیں' تو سوچیے کہ وہ جاتے کہاں۔ ان کا کوئی انتظام ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ

بڑی کثرت سے تھے اوران کی معاشرت کی زندگی کا جزو بن چکے ہوئے تھے۔ یہ کہیں جا ہی نہیں سکتے تھے۔ انہیں تو کہیں ایک وقت کا ٹھکانہ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ ان کے متعلق احکام دیئے کہ یہ جو مثلاً عمرؓ انہوں نے بطور لونڈیوں کے رکھا ہوا تھا' وہ انہیں بیویوں کی حیثیت سے رکھنا ہے۔

پہلے ایک ہی حکم میں ان کا درجہ لونڈیوں سے بیویوں کا بنا دیا' ان کی اولاد اپنی اولاد قرار دیدی گئی اور پھر قدم قدم پر کہا کہ انہیں آزاد کرو' غلام آزاد کرو' ذرا سی یوں لغزش ہوئی تو کہا کہ غلام آزاد کرو۔ ان کے لیے آزاد آزاد آزاد کا نعرہ تھا۔ آہستہ آہستہ ان کو یا تو اپنے معاشرے کا جزو بنا لو یا آزاد کرو اور یہ کہ آزاد کرتے وقت یہ دیکھو کہ اگر کسی غلام میں کما کر کھانے کی صلاحیت ہے لیکن اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے تو اس کو خود سرمایہ دے کر اس قابل بناؤ کہ وہ خود کما کر کھا سکے۔ قرآن کے احکام یہ ہیں۔ قرآن میں جہاں یہ مَـــا مَـلَـکَـتْ اَیْمَانُهُمْ آیا ہے' اس سے اس زمانے میں موجود یہ غلام اور لونڈیاں مراد ہیں۔ اب وہاں گھر میں ان عورتوں کی یہ دو کیٹگریز (Categories) ہو گئی تھیں۔ ایک تو وہ ہے کہ بیوی کی حیثیت سے' نکاح کی حیثیت سے' آئی ہو اور دوسری وہ جو پہلے لونڈیوں کی حیثیت سے تھی اور پھر قرآن نے ان کو بیویوں کی حیثیت دے دی۔ وہاں یہ دو الگ شقیں تھیں۔ ایک شق کو قرآن ازواج کہتا ہے اور دوسری کو مَـا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ تا ہے۔ پھر ان کے ہاں ان کی پوزیشن اور درجے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ قرآن نے تو یہ کیا۔ یہ اس کے بعد کی بات ہے کہ جب پھر وہ ہمارا دورِ ملوکیت آیا ہے۔ تو انہوں نے زمانہ قبل از اسلام کی ہر قسم کی جتنی بھی غیر اسلامی ہندوجاتی رسومات تھیں' ان سب کو اپنے معاشرے کے اندر رائج کیا۔ جب انہوں نے مملکت ہی مشاورت کی بجائے ملوکیت بنا دی تو پہلی ہی مملکت غیر اسلامی ہوئی تو پھر اس کے اندر اسلام کہاں رہنا تھا۔ ہر چیز غیر اسلامی آئی' غلام اور لونڈیاں بھی آئیں' سیلاب کی طرح آئیں۔ آپ کو یاد ہے کہ عباسیوں کے خلفاء (132-656AH بمطابق 750-1258AD) میں سے ایک ایک خلیفہ کے حرم میں تین تین ہزار لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پتہ نہیں یہ کیا انسان تھے اور کیا ان کا معاشرہ تھا۔ وہ کچھ اب تک چلا آ رہا ہے اور اب تک یہ جو ہمارے ہاں کے بڑے بڑے اسلام کے ''سربراہان'' ہیں وہ سارے زور دیتے ہیں کہ لونڈیاں ضرور ہونی چاہئیں۔

پارلیمنٹ کے اجلاس میں ایک مولانا کا مطالبہ

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی حکومت کے دوران ❶ جب عائلی قوانین ❷ آئے تھے کہ چار بیویوں کی بھی پابندی عائد کی

---

❶ یہ بات 9 دسمبر 1983ء کو کہی گئی ہے۔

❷ مغربی پاکستان میں 1964ء میں عائلی عدالتوں کا قانون منظور کیا گیا جس کے تحت عائلی عدالتوں کو (۱) تنسیخ نکاح (۲) مہر (۳) نفقہ (۴) اعادہ حقوقِ زوجیت (۵) ولایت نابالغاں، (۶) جھوٹا دعویٰ نکاح کے مقدمات کی سماعت کا کلی اور بلاشرکت غیرے اختیار عطا کیا گیا۔ (جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن: قانونی لغت (نواں ایڈیشن۔ انگریزی اردو) بی ایل ڈی پبلشرز' 2002ء' ص۔ 226۔

جائے تو پارلیمان میں ایک مولانا صاحب نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اگر یہ پابندیاں عائد کرتے ہو تو کم از کم ایک لونڈی کی تو اجازت دیدو۔ یہ آپ کے ہاں کل کی بات ہے۔ بہرحال اس سے غرض نہیں ہے کہ اس اسلام میں کیا ہوتا رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ میں تو قرآن کا طالبعلم ہوں۔ قرآن نے جہاں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ کہا ہے' وہاں اس سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو اس دَور میں 'زمانہ نزولِ قرآن کے وقت' عرب معاشرے کے اندر موجود تھیں' اور انہیں جذب کرنے اور آزاد کرنے کے سارے احکام قرآن میں موجود ہیں۔ بہرحال قرآن کریم نے جنسی تعلق کو محدود کر دیا۔ کہا کہ اگر اس سے الگ کوئی اور طریق اختیار کرو گے تو وہ خدائی احکام سے سرکشی ہوگی' ان حدود سے تجاوز ہوگا' اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن نے جنسیات پر پابندی عائد کی۔ کہا کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں یہ نظام ہوگا' ان میں پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے جنسی جذبات پر اتنا کنٹرول رکھیں گے۔ یہ ایک چیز ہے اور بڑی ہی اہم۔

قرآنِ کریم کی نظر میں امانت کا مفہوم

عزیزانِ من! اب آگے ایک بڑی ہی اہم بات آتی ہے۔ دو الفاظ آ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دو چیزیں معاشرت اور سیاست کے نظام کی بنیادوں میں سے ہیں۔ پہلی چیز کے متعلق کہا گیا کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (23:8)۔ اس آیت کا عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہدوں' وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔ امانت کے متعلق تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں اس سے کیا مفہوم لیا جاتا ہے: کوئی شخص کہیں جاتے وقت اپنی کوئی چیز' عام طور پہ روپیہ پیسہ ہی ہوتا ہے' کسی کے پاس بطور امانت رکھ جاتا ہے اور پھر جب وہ واپس آتا ہے تو اگر وہ امین ہے' دیانتدار ہے تو وہ اسے واپس دیتا ہے۔ ہمارے ہاں امانت کے یہی معنی ہیں۔ قرآن کا جو مملکت' حکومت' سوسائٹی' معاشرے' کا تصور ہے' اس میں اس امانت کو بڑی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ''امانت'' کی پہلی چیز جس پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا' یہ ہے کہ امانت کا مادہ بھی امن یعنی ''ا م ن'' ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ''ایمان'' کا مادہ امن ''ا م ن'' ہے۔ مومن کا مادہ بھی امن ''ا م ن'' ہے۔ اسلامی معاشرے کی جو بنیادی خوشگوار خصوصیت بتائی ہے' وہ یہ ہے کہ وہ پہلے یہ دیکھے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) انہیں کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا' حزن نہیں ہوگا' امن ہوگا۔ قرآن نے جو کہا ہے' وہ بات تو ذرا بعد میں آئے گی۔ پہلے یہ دیکھیے کہ نظامِ حکومت میں ہوتا کیا ہے؟ جنہیں آپ صاحبِ اقتدار کہتے ہیں' ان کے پاس پیدائش سے' یا کسی جگہ سے آ کے' اختیارات و اقتدارات کی قوتیں اور مال و دولت جیسی چیزیں تو نہیں ہوتیں' وہ عام انسانوں جیسے انسان ہوتے ہیں' ان کے پاس یہ کچھ نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کہاں سے آتا ہے؟ یہ قوم ہوتی ہے جو اپنی ان چیزوں کو ان کے سپرد کرتی جاتی ہے' اپنے اختیارات ان کو دیدیتی ہے' اپنی قوت ان کو دیدیتی ہے' اپنی دولت ان کو دیدیتی ہے۔

یہ کیوں دیدیتی ہے؟ کہا کہ یہ اس لیے دیدیتی ہے کہ تم یہ لو تا کہ ہم امن میں رہ سکیں‘ تم ہمارا امن قائم رکھ سکو۔ ذرا دومنٹ کے لیے عزیزانِ من! غور کیجیے گا کہ بات کیا ہوئی ہے؟ زندگی کو آ ساں بنادیا۔ جوغم ملا‘ اسے غمِ جاناں بنادیا۔ یہ دردِ سر میں کیوں اپنے پاس رکھوں‘ تم اپنے پاس رکھوتا کہ میں رات کو آرام سے سوؤں‘ تم اسے اس کی حفاظت کروتا کہ میں امن میں رہوں۔ اس لیے یہ اقتدار‘ یہ دولت‘ یہ قوت‘ یہ ساری چیزیں‘ اسٹیٹ کو‘ حکومت کو‘ اقتدار کے صاحبان کو‘ قوم دیتی ہے کہ قوم امن میں رہے۔

امانت کے نظام میں اور باطل کے نظام میں فرق

باطل کا نظام یہ ہے کہ قوم جتنا کچھ انہیں دیتی ہے‘ اتنا ہی قوم میں خوف بڑھتا جاتا ہے۔ ہر زائد چیز جو صاحبِ اقتدار کے پاس جاتی ہے‘ غلط نظام میں وہ قوم میں خوف کے بڑھانے کا موجب بنتی ہے۔ اس اختیار واقتدار ملنے سے پیشتر کوئی شخص بھی ہو‘ خواہ صاحبِ اقتدار یا بادشاہ بھی کیوں نہ ہو‘ ڈکٹیٹر بھی کیوں نہ ہو‘ دورِ حاضرہ کے اندر بھی اقتدار کے خواہ وہ جمہوری طریق ہوں‘ خواہ وہ دوسرے طریق ہوں اس سے پہلے تو وہ دوسرے انسانوں جیسے انسان ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ان سے بھی کم درجہ کے ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں کہاں سے آتی ہیں؟ سیدھی سی بات ہے کہ

تمہیں تو ''تم'' کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا
''جناب'' ہم نے بنایا ''حضور'' ہم نے کیا

یہ کچھ انہیں کیوں بنایا‘ کیوں اپنی یہ چیزیں قوم نے ان کو کیوں دیں؟ یہ اس لیے دیں تا کہ قوم کو امن نصیب ہو۔ اسے کہتے ہیں امانت‘ عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ [1] (23:8)۔ یہ وہ صاحبِ اقتدار ہیں کہ جنہیں قوم اپنا یہ سب کچھ دیدیتی ہے تا کہ یہ آرام سے سوئے‘ یہ امن سے رہے؟ اسلامی نظام کی یہ ایک خصوصیت ہے۔ اندازہ لگائیے‘ عزیزانِ من! لمبی چوڑی بحثیں تو رہیں ایک طرف‘ اگر صرف اسی ایک خصوصیت کو پھیلا دیا جائے‘ تو پوچھو نہیں کہ بات کہاں تک چلی جائے۔ ان لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا‘ قوم اپنی ان چیزوں کو ان کے سپرد کردیتی ہے تا کہ قوم امن میں رہے اور یہ لوگ‘ جن کو اس نے کہا ہے کہ صاحبِ اقتدار ہیں یا اس نظام والے ہوتے ہیں‘ وہ قوم کے اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔ اسے ٹرسٹ (اعتماد:Trust) کہا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی ٹرسٹ (Trust) کے معنی یہی ہوتے ہیں یعنی کسی پہ بھروسہ کرنا لیکن قرآن کا لفظ تو بھروسہ سے بھی آگے جاتا ہے۔ قرآن کے نزدیک جب یہ چیز اس مرکز کے حوالے کردی جائے تو انسان کا خوف ختم ہوجاتا ہے‘ اس کو امن نصیب ہوجاتا ہے اور کسی قسم کا ڈر نہیں رہتا۔

---

[1] یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھا (4:58)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تصوف کی دنیا میں بے خوفی کا حصول

عزیزانِ من! جو رہبانیت یا تصوف کے اندر بے خوفی کا تصور ہوتا ہے' اس کا انداز کچھ اور ہوتا ہے: وہ جنگل میں چلا جا رہا تھا' آگے آگے گرو تھا' پیچھے پیچھے چیلا تھا' رات کا وقت تھا' اندھیری رات میں ہر دس قدم پہ وہ کہے: بابا جی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ کہے: اوئے! تجھے ڈر کس بات کا لگ رہا ہے' پاگل چلتا رہ' یہاں تمہیں مار دینے والا کون ہے۔ پھر وہ دس قدم کے بعد کہے: بابا جی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ بابا جی کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے: ٹھہر جا۔ وہ ننگ دھڑنگ تھا۔ ایک لنگوٹی باندھے ہوئے تھا۔ اس سے کہا اوئے! لنگوٹی دی لانگڑ کھول ❶۔ کھولی تو اس میں ایک پیسہ تھا۔ اس نے کہا: پھینک اس کو۔ اس نے اسے پھینک دیا۔ کہنے لگا: آ' اب تمہیں ڈر نہیں لگے گا۔ ڈر تھا اپنے پاس' اس پیسے کا۔ رہبانیت نے تو کہا: کھول کے اس کو پھینک دے۔ اسلام نے کہا: پھینک نہ دے' اسے ان ہاتھوں میں دیدے کہ جو پھر تمہیں امن کے اندر رکھیں۔

طواف کا مفہوم

پیسہ پھینک دینے سے امن نہیں آتا۔ پیسہ ایسے ہاتھوں میں دیدینے سے امن نصیب ہو گا جو اسے تمہارے امن کے لیے ہی صرف کریں گے۔ تم سوؤ گے' وہ راتوں کو پہرہ دیں گے۔ تمہیں پتہ ہے' عزیزانِ من! یہ جو کعبے کا طواف ہوتا ہے' اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ طائفین کس کو کہتے ہیں؟ یہ بات مومن کی صفات میں سے ہے۔ یہ جو رات کو پہرہ دیتے ہیں' جنہیں گشت کرنے والے کہتے ہیں' انہی کو عربی زبان میں طائف کہتے ہیں۔ مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ کعبے کو شہادت میں رکھ کر اس دنیا میں انسانیت سے کہتے ہیں کہ تم آرام سے سوؤ' ہم پہرہ دیں گے۔ انسان' ان افراد سے یہ کہتا ہے کہ یہ لو' یہ ایک پیسہ میرے پاس ہے' اسے بھی تم امن وامان قائم کرنے کے لیے لگا دو۔ قرآنِ کریم نے بڑے عجیب انداز سے ''قل العفو'' ❷ (2:219) کے ایک لفظ میں سمجھا دیا کہ یہ سب کچھ لے لو تا کہ مجھے امن نصیب ہو' یہ میرے لیے ہر وقت دردِ سر بنا ہوا ہے۔

یہ ہے ''قل العفو'' کا نتیجہ

سوچیے' عزیزانِ من! کہ پیسہ دے کر اگر امن نصیب ہو جائے تو یہ کتنا سستا سودا ہے۔ سنیے حضرت یوسفؑ کو زلیخا نے خریدا تھا'

---

❶ لنگوٹ کا بند کھول دے۔

❷ بقدر اپنی ضروریات کے اپنے لیے رکھ لو اور جس قدر ان سے زائد ہے سب کا سب' نوع انسان کی پرورش کے لیے کھلا رکھو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جامی نے ''یوسف زلیخا'' لکھی ہے۔ وہاں مصر کے بازار میں جائے خرید پر پہنچنے کے بعد جب وہ انہیں خرید چکیں تو وہ ایک عجیب شعر ہے' سہیلیوں نے پوچھا کہ تم نے کیا سودا کیا' کہنے لگی: سودا پوچھ رہے ہو:

دراہم چند دادم' جاں خریدم

میں نے سونے کے چند سکے دیئے اور جان خرید لی۔

تعالیٰ اللہ عجب ارزاں خریدم

اللہ کی قسم' سستا سودا کیا ہے؟ دراہم چند دادم' جاں خریدم۔ ❶

عزیزانِ من! اسلامی نظام یہ ہے کہ ہر شخص اپنے چند دراہم ان کے سپرد کر دیتا ہے اور امن خرید لیتا ہے اور اس کے بعد دنیا سے کہتا ہے: تعالیٰ اللہ عجب ارزاں خریدم۔ ❷ غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ قرآن نے ان لوگوں کی خصوصیات بتائی ہیں اور پہلی ہی خصوصیت یہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (23:8) یہ وہ لوگ ہیں کہ قوم جو کچھ امن کے لیے ان کے سپرد کرتی ہے' یہ اسے لیتے ہیں اور قوم کے امن کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔ مومن کے معنی ہیں: دوسرے کے امن کا ذمہ دار۔ ایمان لانے والا تو اس کے ثانوی معنی ہیں' بنیادی معنی دوسروں کے امن کے ذمہ دار ہونے کے ہیں۔ ایمان لانے والی بات دوسری ہے۔

خدا تعالیٰ کی ایک صفت: المومن

قرآن میں تو خود اللہ تعالیٰ کی ایک صفت المومن ہے۔ اگر مومن کے معنی ایمان لانے والا ہو' تو خدا کی یہ صفت کیا ہوئی کہ اللہ مومن ہے۔ ہم تو اللہ پہ ایمان لاتے ہیں' تو اللہ کس پہ ایمان لاتا ہے؟ مومن کے معنی ہیں: امن کی ضمانت دینے والا۔ یہ خدا کی صفت ہے اور جب خدا کے بندوں میں یہی صفت نمودار ہو جاتی ہے تو انہی کو مومن کہتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قوم یعنی امت اپنا یہ سارا کچھ ان کو دے جاتی ہے تاکہ تم ہمارے امن کی ذمہ داری لو۔ وہ بھی مومن ہوتے ہیں' یہ بھی مومن ہوتے ہیں۔ یہ ہے جسے قرآن هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ❸ (23:8) کہتا ہے۔ سوچیے' حضرات! ایک وہ کمیونزم یا سوشلزم کا دعویٰ ہے اور ایک یہ اسلام کے نظام کی بات ہے۔ یہ بات نظام یا قانون سے شروع نہیں کرتا۔ یہ انسانوں سے شروع کرتا ہے۔

---

❶ میں نے سونے کے چند سکے (Coins) دے کر جان خرید لی۔

❷ اللہ کی قسم! کتنا سستا سودا کیا ہے!

❸ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھا (4:58)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سوال صرف نظام کا نہیں ان ہاتھوں کا بھی ہے کہ جنہوں نے یہ نظام قائم کرنا ہے

عزیزانِ من! اگر چہ وہ بات تو میرے سامنے ہے' میں اس کا اعلان بعد میں کرونگا۔ آئندہ درس پر ربیع الاول کے مقدس مہینہ میں عید میلا دالنبی کی تقریب ہے۔ آئندہ جمعہ یا آئندہ درس اسی تقریب کے ضمن میں ہمارے سامنے آجائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرا ایسی تقاریب پہ ایک درسِ خصوصی ہوا کرتا ہے اور پھر یہ تقریب تو وہ ہے جسے میں نزولِ قرآن اور حضورﷺ کی دنیا میں تشریف آوری سمجھتا ہوں۔ ہمارے لیے یہ دو ہی تو جشن کے میدان ہیں۔ تو اس پہ میں نے اس دفعہ ذہن میں رکھا ہی یہ ہے کہ یہ نظامِ اسلام قائم کرنے والے کس قسم کے ہوتے ہیں' اصل چیز ہی یہ ہے۔ نظام کے متعلق گفتگو تو ایک نظری بحث ہے' وہ تو کی جاسکتی ہے مگر یہ نظام قائم کرنے والے کس طرح کے ہوتے ہیں' اصل چیز ہی یہ ہے۔ اگر ہم ساری گفتگو کرتے بھی ہیں تو وہ نظام کے متعلق ہی کرتے ہیں کہ یہ ایسا ہوتا ہے' یہ ایسا ہوتا ہے۔ وہ تو بعد کی بات ہے کہ جن کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوتا ہے' وہ کیسے ہوتے ہیں۔ اس دفعہ کے عید میلا دالنبیؐ کی تقریب کا جو درس ہے وہ آئندہ جمعہ کو ہی ہے۔ اس میں میرا عنوان ہی یہ ہے اور اتفاق سے ہی یہاں بھی یہ بات آگئی کہ اس نظام کے قائم کرنے والوں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ **ھم لامٰنتھم**. وہ امن کے قیام کے لیے ہیں اور اس کے بعد **و عھدھم**. وہ معاہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔ عہد کا ترجمہ تو ہمارے ہاں وعدہ ہی کیا جاتا ہے۔ جس کو ہم Promise کہتے ہیں۔ یہ وعدہ اور عہد دو الگ چیزیں ہیں۔ عہد کے معنی ہوتا ہے: کسی چیز کی مسلسل حفاظت کی ذمہ داری لے لینا۔ یہ ان کو دیتے ہیں اور وہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

(غالب)

یہ ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہے۔ اب دیکھیں کہ یہ دو چیزیں امانات اور عہد کتنی اہم ہوگئیں' اس معاشی نظام کی کتنی بنیادی ہوگئیں۔ اور پھر ان کی مسلسل حفاظت کی ذمہ داری لے لینا اور بھی کس قدر اہم ہوگیا۔ جو دیں تو پھر ان کو دینا' جو اس کی حفاظت کرنا' اور ان کو امن کی ضمانت دیدینا نبھا سکتے ہوں۔ یہ ہے بنیادی چیز' یہ ہے ان انسانوں کی بنیادی خصوصیات جو ان افراد میں بدرجہ اتم ہوگی' اس نظام کو قائم کرنے کے اہل ہوں گے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (70:33) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جس بات کے متعلق انہوں نے کہنا ہے کہ ''ہاں ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ سچی چیز ہے'' وہ اس پر قائم رہتے ہیں۔

قانونِ شہادت اور ہم

عزیزانِ من! دنیا میں نظامِ عدل کی بنیاد ہی شہادت کے قانون پہ ہے۔ یہ قانونِ شہادت (Law of Evidence) عدل کے نظام کی بنیاد ہے' اگر وہ شہادت یہ ہے جو آپ کے ہاں قانونِ ❶ شہادت کی صورت میں آج کل مرتب ہو رہا ہے اور ابھی باہر نہیں آیا تو اس میں عورت کی شہادت قابلِ قبول ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلے جو حدود کے کچھ آرڈیننسز (Ordinances) آ گئے ہیں' ان میں شہادت کے متعلق جو بات آئی ہے' وہ یہ ہے کہ اس میں ان کی تو شہادت ہی قبول نہیں۔ ہماری ان بیٹیوں اور بہنوں کی شہادت ہی قبول نہیں۔ ''بھلا ہویا' میں نیڑیوں چھٹیا' میری ساری لنگ گئی'' ❷ بعض نے کہا ہے کہ یہ بہت ظلم ہے۔ کچھ کہنے لگے: اچھا تو پھر عورت کی شہادت کے متعلق کیا حکم ہے۔ کہنے لگے کہ آدھی شہادت ہے۔ یہ آدھی شہادت بھی عجیب چیز ہے۔ بہرحال یہ دوسرا قصہ ہے۔ یہاں کہا ہے کہ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (70:33) جب کبھی کسی معاملہ میں شہادت دیتے ہیں تو ہمیشہ حق وانصاف پر قائم رکھتے ہیں۔ نظامِ عدل ہی اس شہادت کے اوپر ہے۔ قَآئِمُوْنَ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس مجسٹریٹ نے ملزم سے کہا کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ کہنے لگا: جی' چوبیس سال۔ کہنے لگا: چوبیس سال؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ پانچ چار سال ہوئے' کسی جرم میں تم میری عدالت میں آئے تھے' تو میں نے تم سے پوچھا تھا تو تم نے کہا تھا: جی' عمر چوبیس سال ہے۔ آج بھی کہتے ہو چوبیس سال۔ کہنے لگا: جی' ہم ان میں نہیں ہیں کہ آج کچھ کہہ دیا کل کچھ کہہ دیا۔ ایک تو شہادت پہ قائم رہنے والے ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! صحیح نظام میں عدل کی بنیاد قانونِ شہادت پر ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ قرآن ایک جگہ تو ایک لفظ کہتا ہے' پھر دوسری جگہ اس کی تفصیل دیتا ہے۔ شہادت کے متعلق کہا ہے: یاد رکھو! مومن جو شاہد یا گواہ ہو' اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر شہادت

---

❶ قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ پاکستان نے متحدہ ہندوستان کے بہت سے دوسرے قوانین کی طرح قانونِ شہادت مجریہ 1872ء کو بھی اپنا لیا تھا۔ یہ قانون پاکستان میں 28 اکتوبر 1984ء تک رائج رہا۔ اسی قانون کا مسودہ سرجیمس فٹز جیمس اسٹیفن (Sir Jamesfitz James Stephen) نے تیار کیا تھا۔ جناب جسٹس ایم منیر (ص 1895) نے اپنی کتاب (Principles and Digest of Law of Evidence) میں اس قانون کو اپنی نوعیت کا ایسا واحد قانون قرار دیا ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ 28 اکتوبر 1984ء کو صدر پاکستان نے اپنے ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جو انہیں اس ضمن میں حاصل ہیں' حکم نمبر 10 بابت 1984ء کے ذریعہ قانون شہادت مجریہ 1972ء کو منسوخ کرتے ہوئے اس کی جگہ قانونِ شہادت 1984ء کا نفاذ کیا اور 28 اکتوبر 1984ء سے اب یہ نیا قانونِ شہادت پاکستان میں نافذ ہے۔ (تراب احمد: قانونِ شہادت' مکتبہ فریدی' کراچی' 1985ء' ص۔ 11۔

❷ خوب اچھا ہوا کہ میں تو جلدی ہی چھوٹ گیا میری تو ساری عمر یونہی گزر گئی۔ (مجھ پہ اس کا اطلاق نہیں ہوگا)۔

اس کی اپنی ذات کے بھی خلاف جائے تو وہ سچی شہادت دیتا ہے۔ اپنی ذات کے بھی خلاف جائے! یہ بات قابلِ توجہ ہے۔ اور آگے ہے کہ اگر شہادت والدین کے خلاف جائے' رشتہ داروں کے خلاف جائے' دوستوں کے خلاف جائے اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر خود اپنی ذات کے بھی خلاف جائے تو پھر بھی وہ سچی شہادت دیتا ہے۔ پورا نظامِ عدل اس شہادت پر قائم ہے۔

انسان کا شدید ترین کنٹرول شکن جذبہ

عزیزانِ من! قرآن نے یہاں یہ تین چار خصوصیات ہی بتائی ہیں' دوسرے مقامات پر بھی مومنین کی خصوصیات بتائی ہیں لیکن یہی کچھ کم نہیں ہیں۔ انسان کے اندر سب سے شدید ترین جذبہ جو کنٹرول کو توڑتا ہے' وہ جنس کا جذبہ ہوتا ہے۔ مومن اس جذبۂ جنس پہ کنٹرول کرنے والا ہے۔ امانات کی اس طرح سے حفاظت کرنے والا ہے کہ ہر ایک کو امن نصیب ہو جائے۔ نظامِ عدل کی بنیاد جس شہادت پہ ہے یہ اسے قائم رکھنے والا ہے۔

بات آئی تھی مصلین کی' جنہیں ہم نے نماز پڑھنے والے کہا ہے' ان کے لیے قرآن کریم نے کہا ہے: اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ [1] (70:34) یہ صلوٰۃ ہے جس پر وہ ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور یہ آج کل مصلی ہیں' جنہیں ہم نمازی کہتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ باپ نے آ کر کہا کہ میں وہ سودا کر آیا ہوں۔ بیٹے نے کہا کہ ابا جان! یہ تو آپ بڑا گھاٹے کا سودا کر آئے ہیں' یہ تو بڑی بری بات ہوگئی' اس کو تو فسق کیجیے۔ کہنے لگا: ''کوئی گل نہیں ڈرنے کی۔ کرلاں گے اسیں کجھ۔ کہنے لگے: کرلو گے تاں ہنے کچھ کرلو۔ کہنے لگے: اوئے کوئی گل نئیں۔ اسیں رپھڑ پا دیاں گے۔ کہنے لگا: جی' جاؤ تے اے کر آؤ۔ کہنے لگے: ہن نمازِ عصر دا تا ویلا تنگ ہوندا جاندا ہیگا اے۔ میں اے نماز پڑھ لاں' تے فیر مگروں' اے کرلاں گا۔ کوئی گل نئیں۔ [2] مگر قرآن کہتا ہے کہ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ (70:34) وہ لوگ خدا کے متعین کردہ نظامِ صلوٰۃ کے محافظ ہوتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّکْرَمُوْنَ (70:35) یہی لوگ ہیں جو باعزت جنتی معاشرہ کے مستحق ہیں۔ اور پوچھتے ہو کہ جنت میں کون جائے گا؟ سنو یہ ہے جن کو جنتی کہتے ہیں۔ اور پھر جنت کی تعریف بتائی۔

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے جو اس نظام میں ضمانت دی ہے' وہ صرف رزق کی ضمانت نہیں دی' رزق

---

[1] یہ لوگ خدا کے متعین کردہ نظامِ صلوٰۃ کے محافظ ہوتے ہیں۔ (خود اس پر التزاماً قائم رہتے ہیں اور اسے قائم و مستحکم رکھنے کے لیے کوشاں و سرگرداں)

[2] ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ واپس آ کر کچھ کرلوں گا۔ کہنے لگے: جی! کیا کرلو گے؟ ابھی کرلو۔ کہنے لگے: ارے کوئی بات نہیں۔ ہم جھگڑا کھڑا کردیں گے۔ کہنے لگا: جی! جاؤ اور یہ کر آؤ۔ کہنے لگے: اب نمازِ عصر کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ میں نماز ادا کرلوں تو آ کر یہ کرلوں گا۔ اس کی کوئی بات نہیں۔

کریم کی ضمانت دی ہے' یعنی باعزت روٹی کی ضمانت دی ہے۔ اور روٹی کی محتاجی انسان کو ذلیل کرتی ہے۔ نظر آتا ہے کہ قرآن نے ہر جگہ رزق کریم کہا ہے۔ یہاں جنّت کہا ہے۔ جسے جنت کہا جاتا ہے' یہ بڑی جامع اصطلاح (Term) ہے۔ وہ قیامت والی جنت تو وہاں آئے گی' ہم وہیں دیکھیں گے۔ یہ جن کی خصوصیات بتائی چلی جارہی ہیں' ان کا سارا نظام یہاں قائم ہورہا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ یہ وہ جنتی معاشرہ ہے جس میں دینے والے اور لینے والے دونوں کی عزت وتکریم باقی رہتی ہے۔

جنت کی تعریف اور ایک لفظ رزقِ کریم

عزیزانِ من! یہ جنت وہ ہے جو مکرمون کی جنت ہے۔ اس سے اگلی ہی آیات میں کہا کہ فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ o عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ o اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ (70:36-38) یہ جو اس کی تکذیب کرتے چلے آرہے ہیں' جو ان خصوصیات کو بالائے طاق رکھے ہوئے ہیں' ان میں سے کوئی چیز ان کے پاس نہیں ہے۔ جب یہ جنتی معاشرہ ان مومنین کے ہاتھوں سے قائم ہوگا تو اس کی خوشگواریوں کو دیکھ کر یہ تمہاری طرف دوڑے ہوئے آئینگے کہ صاحب! ہمیں بھی Admit (داخل) کرلیجیے۔ ہمیں بھی ٹکٹ دیدیجیے' ہمیں بھی پاس دیدیجیے۔ کہنے لگے: یہ کیا چیز کہتے ہیں؟ ان ٹکٹوں اور پاسوں سے اس جنت میں نہیں آیا جاسکتا' مگر دوسروں کو دیکھ کر یہ بھاگے ہوئے آئیں گے۔ یہ ہے' عزیزانِ من! اسلام کی تبلیغ کا طریق کہ ایسا نظام قائم کیجیے جس کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر دنیا' يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:2)' دنیا گروہ در گروہ اس طرف بھاگی ہوئی آئے۔ کہا کہ انہوں نے یہ خصوصیات تو پیدا نہیں کیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ انہیں بھی اس جنتِ نعیم کے اندر حصہ مل جائے۔ قرآن کریم نے کہا ہے: كَلَّا (70:39) نہیں' وہ جنتی زندگی اس طرح نہیں مل سکتی۔ بڑا عجیب اعلان ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا؟ اس کے ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ [1] (70:39)۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم نے ان کی پیدائش کا کیا مقصد بتایا ہے؟ وہ مقصد قرآن نے بتایا ہوا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ [2] (51:56)۔ ہمارے ہاں اس کا بھی عجیب ترجمہ ہوتا ہے۔

---

1. انہیں اس کا اچھی طرح سے علم ہے کہ ان کی خلقت سے مقصود یہ تھا کہ یہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں (51:56) سو جب یہ' اس کے برعکس' ان قوانین سے سرکشی اختیار کریں تو پھر' زندگی کی خوشگواریوں کے امیدوار کیسے ہوسکتے ہیں؟ (یعنی یہ لوگ جنتی معاشرہ متشکل کرنے والے نظام کے قیام کی راہ میں تو سنگِ گراں بن کر حائل ہوں اور توقع یہ رکھیں کہ اس کی آسائش بخش برگ و باران کی جھولی میں آپڑیں۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے)(مفہوم القرآن۔ پرویز)

2. اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ انسان' خواہ وہ مہذب شہری ہوں' یا صحرا کے خانہ بدوش غیر مہذب قبائل' ان کی تخلیق کی غرض وغایت اسی صورت میں پوری ہوسکے گی کہ یہ قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کریں (اور انہیں نوعِ انسان کی پرورشِ عامہ کے لیے وقف کرکے عالمگیر نظامِ ربوبیت متشکل کردیں)۔ (ایضاً)

عبادت کا مروّجہ مفہوم

عزیزانِ من! ہمارے ہاں عبادت کا ترجمہ پرستش کیا جاتا ہے۔ قرآن کی اس آیت (51:56) کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے جن اور انس کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ یہ ہماری عبادت کرتے رہیں۔ عبادت کا ترجمہ ہوا کہ یہ ہماری پرستش کرتے رہیں' پرستش کے معنی ہوئے: نماز پڑھتے رہیں۔ تو پھر اس کے لیے ہمارے ہاں عجیب عجیب تفسیریں آتی ہیں کہ صاحب! قرآن نے تو کہا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ یہ پرستش کرتے رہیں' ان کو تو ہر وقت پرستش کرتے رہنا چاہیئے' عبادت کرتے رہنا چاہیئے' اب جو وقت عبادت میں نہیں گزرتا وہ بات تو پھر اسکے خلاف چلی گئی۔ وہ کیسے ہوگا؟ اس پر انہوں نے کہا کہ ہمیں تفسیر بھی آتی ہے' کوئی بات نہیں ہے۔ تو پھر اس کی یہ تفسیر ہوئی کہ جو مومن صبح کی نماز پڑھ لیتا ہے اور اس کے بعد پھر ظہر کی پڑھتا ہے' تو درمیان کا سارا وقفہ اس کا عبادت میں گزرجاتا ہے۔

چل بھئی' شام تیکر ❶ عبادت ہی عبادت ہے حتیٰ کہ رات کو نماز پڑھ کر سو جاتا ہے' صبح اٹھ کر نماز پڑھتا ہے' تو ساری رات کی نیند بھی عبادت میں گزرتی ہے۔ یوں وہ قرآن کی تفسیر پوری ہوتی ہے کہ ہم نے تمہیں اس لیے پیدا کیا کہ ہماری عبادت کرتے رہو۔ بس وہ ذرا سے تراجم اور تفاسیر کو یوں کیا تو بات کچھ سے کچھ ہوگئی۔ طبری ❷ نے پہلے وہ سارا نقشہ ہی الٹ دیا۔ اس نے صرف ایک لفظ کے ترجمہ سے نقشہ ہی اُلٹ دیا۔

عزیزانِ من! اس زمانے کے ان عربوں سے پوچھو کہ وہ عبد' عبادت' عابد اور معبود کے کیا معنی لیتے تھے۔ یہاں (70:36-37) یہ بات ہو رہی تھی کہ جب ان کفار نے اسے سنا تو یوں سمجھ بیٹھے گویا جنت مفت بٹ رہی ہے' چلو ہم بھی اس لوٹ کے مال سے کچھ حصہ لے لیں' چنانچہ وہ اس خیال کے تحت گروہ در گروہ دائیں بائیں سے لپک کر تیری طرف بھاگے ہوئے چلے جا رہے ہیں کہ ہمیں بھی اس جنت کے اندر حصہ دو۔ کہا کہ ان سے پوچھو کہ ہم نے انہیں بتایا نہیں تھا کہ تمہاری پیدائش کا مقصود ہی یہ ہے کہ صرف خدا کے قوانین کی تابع داری کرو' فرماں برداری کرو' محکومیت اختیار کرو' کسی اور کی نہیں۔ عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں۔ صرف خدا کے قانون کی محکومیت اختیار کرو' کسی اور انسان کی نہیں اور تم نے تو انسانوں کی محکومیت اختیار کی ہوئی تھی تو تم اس جنت میں کیسے آسکتے ہو۔ صاحب! یہ تو شرک ہے۔ تم یہاں نہیں آسکتے۔ کہا کہ فَلَآ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ o عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ خَیۡرًا مِّنۡهُمۡ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ (70:40-41) ❸۔ ان سے کہو جو اپنے آپ میں اس قدر تکبر اور تمرد کے نشے میں بدمست ہیں کہ ہمیں

---

❶ تک

❷ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (224-310ھ)۔ ان کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء ص۔ 31۔

❸ خدا کی ربوبیت عامہ جو اس کائنات کے مشارق و مغارب میں اس نظم و ضبط کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے' اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جو لوگ انسانی معاشرہ میں اس نظامِ ربوبیت کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جائیں' ہم اس پر قادر ہیں کہ ہم ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہوں۔ یہ مخالفین' نہ تو ہمارے حیطۂ اقتدار سے باہر جا سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری اسکیموں کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ناتواں نہ سمجھو ہم اس پوری کائنات کو اور اس کے نظام کو جو ہمارے قوانین کے تابع چلتا ہے' گواہی میں لاتے ہیں۔

تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں گے

ہم میں یہ قوت' یہ اقتدار بھی ہے کہ ہم تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں۔ ہم ایک خدا ہیں اور تمہیں پتہ ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم کرتے یہ ہیں کہ اس قسم کی جو تمہارے جیسی قومیں ہوتی ہیں' ہم ان کو زندہ قوموں کی صف سے الگ کر دیا کرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسری قوم لے آیا کرتے ہیں جو خیرا مہ۔ ہیں' یعنی جو اس سے بہتر ہوتی ہے۔ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ (47:38) پھر وہ ان جیسی نہیں ہوتی ان سے بہتر قوم ہوتی ہے۔ قوموں کی جگہ دوسری قومیں آ جاتی ہیں۔ کہا: یاد رکھو' ہم ایسا کر سکتے ہیں' تم ہمارے راستے میں حائل نہیں ہو سکتے' تم ہمیں عاجز نہیں کر سکتے کہ ہم ایسا نہ کریں۔ اس کے بعد جماعتِ مومنین اور نبی اکرمؐ سے کہا ہے کہ فَذَرۡهُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَ یَلۡعَبُوۡا ❶ (70:42)۔ یہ عجیب چیز ہے۔ یَخُوۡضُوۡا کے معنی ہیں: باتیں ہی باتیں کرتے چلے جانا' بحثیں ہی بحثیں کرتے چلے جانا' کانفرنسیں' سیمینار' مذاکرات' گفتگوئیں' باتیں ہی باتیں کرتے چلے جانا۔ کہا کہ انہوں نے زندگی کا یہ مقصد سمجھا ہے کہ باتیں ہی باتیں کرو۔ وَ یَلۡعَبُوۡا اور قوم سے کھیلتے رہو۔ کہا: ان کو ان چیزوں کے اندر چھوڑ دو' ان کو یہ سب کچھ کرنے دو اور اس کے بعد یہ ہوگا کہ ان کی جگہ دوسری قوم لے لے گی اور وہ قوم ان سے بہتر ہوگی۔ حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ (70:42) تا آنکہ وہ انقلاب ان کے سامنے آ کھڑا ہو' وہ دن آ جائیں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے اور پھر جب ان کی تباہی ہو اور ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لے۔ دیکھیے یہ ''یوم'' وغیرہ اسی دنیا میں ہی ہو رہا ہے کہ ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے۔ انہوں نے زندگی کو مذاق اور کاروانِ انسانیت کو بے منزل سمجھ رکھا ہے۔ اس روش اور ذہنیت کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

تم تیر کی طرح اپنی حفاظت کے نشانے کی طرف بھاگو گے

عزیزانِ من! اس تباہی کے دن یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا کَاَنَّهُمۡ اِلٰی نُصُبٍ یُّوۡفِضُوۡنَ (70:43) یہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے تیزی سے نکلیں گے اور یوں نکلیں گے جیسے تیر اپنے نشانے پہ جاتا ہے۔ یہ کسی حفاظت کی جگہ کی تلاش میں اس طرح بھاگ رہے ہونگے اور یوں یہ کشاں کشاں اپنی تباہی کے مقام پر جمع ہو جائیں گے۔ اس وقت ان کی یہ حالت ہوگی۔ اور خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ (70:44) عجز و واماندگی سے نگاہیں جھکی ہوئی' ندامت اور شرم سے چہرے سیاہ ہوئے ہوں گے۔ یہ بتایا انجام' ایسی قوم کا۔

---

❶ سو تو ان کی پرواہ مت کر' انہیں ان کے بے معنی منصوبوں اور بے مقصد کوششوں' بے منزل سفر اور فطری مباحثوں' بیکار گفتگوؤں اور کھیل تماشوں میں مشغول رہنے دے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! ذِلَّۃٌ (70:44)۔انسانیت کا سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے' مگر انسان ذلیل ہو جائے' ذلیل محسوس کرنے لگ جائے' دنیا اسے ذلیل کہنے لگ جائے۔قرآنِ کریم نے یہ سب سے بڑا عذاب بتایا ہے۔ ذٰلِکَ الْیَوْمُ الَّذِیْ کَانُوْا یُوْعَدُوْنَ (70:44) یہ ہے وہ دن جس کے متعلق ان سے کہا جاتا تھا کہ اس سے ڈرو'اس سے بچو' یہ دن نہ آنے دو' تباہ ہو جاؤ گے' دنیا کے اندر ذلیل ہو جاؤ گے' اور تم ہو کہ تقاضے پر تقاضا کرتے چلے جا رہے ہو کہ وہ یوم......اس انقلاب کا دن......جلدی کیوں نہیں آتا (70:1)۔

عزیزانِ من! سورۃ المعارج اس آیت پہ ختم ہوتی ہے! آئندہ ہم اگلی سورۃ نوح لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنویر مفتی، سویڈن

''ماں کے پاؤں تلے جنت ہے''

''اس دنیا میں بھی''

یہ الفاظ ہمارے پیغمبر محمدﷺ کے ہیں۔ لہٰذا قابلِ غور اور قابلِ فکر ہیں۔ ہمارا ایک المیہ یہ ہے کہ ہم الفاظ کو ان کے لفظی معنوں میں ہی لیتے ہیں لیکن عموماً الفاظ کے پیچھے کچھ مزید چھپے ہوئے معانی بھی ہوتے ہیں ان کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ تبدیل نہیں ہوئے اور نہیں کئے جا سکتے تو یہ قطعی درست ہے۔ کسی انسان کو الفاظ میں تبدیلی کرنے کا نہ حق ہے اور نہ وہ سوچ سکتا ہے لیکن قرآن کے الفاظ کے لفظی معنوں میں الجھ جانا جمود قائم کرتا ہے۔ ان الفاظ کی تشریح وتعبیر کو Update کرنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ جب تک Update نہ ہوں گے ہم ان کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں گے۔ اسی طرح حضرت محمدﷺ کے بہت سے الفاظ بھی آج کی دنیا میں بڑے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اگر انہیں Update کر کے سمجھا جائے۔ **Update** کرنے سے میری مراد آج کے علوم وتحقیقات کی روشنی میں دیکھا اور سمجھا جائے۔ میں نے قرآن اور پیغمبر محمدﷺ کے الفاظ کو علمِ نفسیات کی عینک لگا کر پڑھا ہے۔ میں نے قرآن اور حضرت محمدﷺ کے الفاظ کو علمِ نفسیات کی تھیوری میں پرکھا ہے۔ بہ حیثیت علمِ نفسیات کے طالب علم کے مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر بھی جھجک نہیں کہ علم نفسیات کے نقطۂ نظر سے میں نے علم نفسیات پر قرآن سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ آپ صرف اس مثال سے اندازہ لگائیں کہ ایک شخص 23 سال کی قلیل عمر میں ایک قوم کو نہ صرف مکمل تبدیل کر دیتا ہے بلکہ دنیا کے نقشہ پر حاوی کر دیتا ہے۔ میرا مطلب حضرت محمدﷺ کے 23 سالہ دورِ نبوت سے ہے جس میں انہوں نے ریگستانوں میں سرگرداں، بے کار اور عیاش عربوں کو ایک عظیم قوم میں بدل دیا۔ Group Therapy کی اس سے عمدہ مثال اور کوئی نہیں ملتی۔

آیئے آج حضرت محمدﷺ کے الفاظ ''ماں کے پاؤں تلے جنت''، پر کچھ غور کریں۔ ہمارے معاشرہ میں اس کا مطلب یہاں تک لیا جاتا ہے کہ ماں کی خدمت کرو۔ اس کا کہا مانو' اس کا دل نہ دکھاؤ' اس کا ہر حکم مانو وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور جنت عطا کرتا ہے۔ لیکن میری نظر میں اس جملے کی یہ تشریح صرف ناکافی ہی نہیں بسا اوقات معاشرہ میں خرابیوں کا باعث بھی ہے۔ ان خرابیوں کی تفصیل میں تو جانے کی گنجائش اس مضمون میں نہیں۔ اس مضمون کا مقصد اس فقرے کے کچھ اور پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے۔

یہ الفاظ شاید براہ راست ماؤں کو بھی کہے گئے تھے کہ ان کے پاؤں تلے جنت ہے جو وہ اپنی اولاد کو مہیا کر سکتی ہیں۔ یاد رہے کہ میں یہ سب کچھ علم نفسیات کے پہلو سے لکھ رہا ہوں۔

ایک ماں اپنی پرورش اور تربیت سے اپنی اولاد کی زندگی کو جنت بنا سکتی ہے۔ پرورش اور تربیت غالباً دو الگ چیزیں ہیں۔ پرورش بچے کی بنیادی ضروریات کے خیال رکھنے کو کہتے ہیں۔ وقت پر کھانا دینا' پینے کو دینا' سردی گرمی سے محفوظ رکھنا' پیار دینا اور خطرات سے بچانا وغیرہ پرورش میں شامل ہے۔

پرورش چرند پرند بھی کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کی فطرت میں شامل ہے۔ جانوروں اور پرندوں کے بچوں کی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ فطرتاً ہی اپنے کام کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ مثلاً پرندوں کے بچوں کو اڑنے کے لئے کسی سکول بھیجنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا بطخ کے بچے کو تیراکی کا کورس کرنے کی ضرورت نہیں اس کے برعکس انسانی بچے کی تربیت بہت ضروری ہے اور اسے سب کچھ سکھانا پڑتا ہے اور بچے کا پہلا سکول جو غالباً سب سے اہم بھی ہے' وہ ہے ماں' اس کی گود اور اس سے جذباتی وابستگی۔ اس تعلق میں خرابی یا خامی بچے کی آنے والی زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ بچہ جب 5 یا 6 سال کی عمر میں سکول شروع کرتا ہے تو اس کی تربیت کا عمل شروع ہوتا ہے۔ جبکہ فرائڈ (Frued) کے بقول پہلے 5 یا 6 سال میں بچے کی شخصیت کی بنیاد پڑ چکی ہوتی ہے۔ ویسے بھی بچہ کی تربیت کرنا سکول کے فرائض میں شامل نہیں ہوتا۔ ماں اور بچے کی جذباتی وابستگی کا بچے کی آنے والی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس وابستگی اور تربیت میں خلل قریباً قریباً آنے والی زندگی پر بہت منفی نتائج چھوڑتا ہے۔ ذہنی مریضوں اور جرائم پیشہ افراد پر کی گئی بہت ساری تحقیقات اسی طرف کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بچپن کی اس عمر میں جس میں والدین تربیت کی طرف توجہ نہیں دیتے' اسی عمر میں ذہنی امراض اور جرائم پیشہ زندگی کی بنیادیں پڑ جاتی ہیں۔

کسی نے یہ شاید درست ہی کہا ہے کہ جب کوئی

شخص اپنی اولاد میں کوئی اچھی یا بری حرکت، بات دیکھتا ہے تو دراصل وہ وہی کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے جو اس نے خود بویا ہوتا ہے۔ کوئی بھی والدین اپنی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ لیکن کوتاہی، تربیت کی طرف توجہ نہ دینا اور کمزور ماں کا بچے کی ہر جائز و ناجائز ضروریات پوری کرنا بچے کے مستقبل کو خراب کرنے کا باعث بنتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں عموماً باپ ایک سخت ڈکٹیٹر کا رول اپنا لیتا ہے جس کے ردعمل کے طور پر ماں ایک انتہائی نرم اور کمزور رول اختیار کر لیتی ہے۔ جس سے توازن بگڑ جاتا ہے اور بچے کے ذہن میں Conflict پیدا ہو جاتا ہے۔

میری رائے کے مطابق ایک ملک، ایک سوسائٹی، ایک معاشرے یا ایک گھر میں سب کے لئے ایک ہی قانون ہونا ضروری ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ اس اصول پر کاربند نہیں۔ ہمارے گھر اسی معاشرہ کا حصہ اور پیداوار ہیں۔ ہمارے گھروں کی اکثریت میں والدین کے پاس بچے کی تربیت کا عموماً کوئی پلان ہوتا ہی نہیں۔ تقاضا ضرور ہوتا ہے کہ بچہ کلاس میں اول آئے اور ڈاکٹر، انجینئر یا پائلٹ بنے۔ یہ سب ممکن اسی وقت ہوگا جب تک ماں کے رول و کردار اور باپ کی اہمیت اور ذمہ داریوں کو سمجھا جائے گا۔

اب ان دنوں مغربیوں کی دیکھا دیکھی ہماری خواتین بھی گھروں سے نکل کر کام کاج کر رہی ہیں۔ اس میں کوئی برائی نہیں، دیکھنا یہ ہوگا کہ اس کی قیمت کیا چکانی پڑتی ہے؟

گھریلو کام کاج اور بچے کی پرورش و تربیت کو اپنے معیار سے گرانے کا عمل (Devalued) مغرب نے کیا۔ یعنی گھروں میں بیٹھنا اور گھریلو کام کاج اور بچوں کا خیال رکھنا ایک کم تر فریضہ سمجھا گیا۔ حالانکہ جو خواتین یہ کچھ کرتی تھیں اور کرتی ہیں وہ اپنے ہی گھر اور بچوں کے لئے کر رہی ہوتی ہیں۔ چند ایک بچوں کی اعلیٰ تربیت اور دیکھ بھال کرنا، کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی کام ہو سکتا ہے؟ لیکن بگاڑ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مرد اپنے کما کر لانے کے فعل کو اعلیٰ تر سمجھے اور عورت کا استحصال کرے۔ اسلام خاندانی زندگی (Family life) پر زور دیتا ہے۔ اس کی رو سے مرد کو کسی بھی لحاظ سے بہتر مقام حاصل نہیں۔ میری نظر میں اس کے کما کر لانے کے باوجود عورت جو گھر سنبھال رہی ہے اور سب سے بڑھ کر چند ایک بچوں کی پرورش اور تربیت کر رہی ہے اس کا کام زیادہ اعلیٰ اور مقدم ہے۔ یاد رہے کہ اس کی ان ہی کاوشوں سے ان کے بچوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں جنت مل سکتی ہے۔ میرا عورت کے گھر سنبھالنے اور بچوں کی پرورش کا ایک غلط مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ میں عورت کے گھر سے نکلنے یا اس کے کام کاج کرنے کے خلاف ہوں۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ میرا مطلب بچہ کی زندگی کے پہلے چند سالوں سے ہے۔ جس میں اس کی شخصیت کی بنیادیں پڑتی ہیں۔ ان چند سالوں میں اس سے

بہتر اور مقدم اور کوئی کام ہو نہیں سکتا کہ ایک بچہ کو زندگی کا اچھا اسٹارٹ دے دیا جائے۔ جب یہ مرحلہ کامیابی سے گزر جائے تو عورت کو گھر سے باہر نوکری یا کام کاج کر لینے میں قطعی کوئی حرج یا پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ ملک وقوم کی ترقی کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ خواتین معاشرہ کی بہتری کے لئے پورا پورا رول ادا کریں۔ موضوعِ تحریر سے ملتی جلتی کچھ اور احادیث ملاحظہ فرمائیے:

☆ ''ماں سے بڑھ کر کوئی استاد نہیں۔''

☆ ''ماں کی آغوش انسان کی پہلی درسگاہ ہے۔''

☆ ''ماں دنیا کی عزیز ترین ہستی ہے۔''

یہ سب احادیث جہاں ماں کے وقار وعظمت کی طرف اشارہ کرتی ہیں وہیں ماں کو اس کے اہم رول نبھانے کی نشاندہی بھی ہے۔ اس ضمن میں برطانوی ماہرِ نفسیات John Bowlby کی Theory of attachment ماں اور بچے کے تعلق پر روشنی ڈالتی ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے اس کے مطابق اگر ماں اور بچے میں ایک اچھا رابطہ استوار نہ ہو تو اس کے نتائج اکثر بچے کو اپنی آنے والی زندگی میں بھگتنے پڑتے ہیں۔ مثلاً ماں پیار کا پہلا Object ہے اگر وہی پیار دینے سے محروم رہے تو پیار نام کی چیز کا شخصیت میں فقدان رہ جاتا ہے۔ جو آنے والی زندگی کے مختلف رول میں ظاہر ہوتا نظر آتا ہے۔ جب بچے کے پاس پیار نام کی کوئی شے موجود نہ ہوگی تو وہ کسی اور کو وہ کیسے دے سکے گا؟

اچھی ماں ایک اچھی قوم اور نسل کی بنیاد ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ہر ماں کو اعلیٰ علم و تربیت سے آراستہ کیا جائے گا۔ ایک جسمانی' ذہنی اور اعصابی طور پر مضبوط ماں ہی بچہ کی شخصیت کی مضبوط بنیادیں ڈالتی ہے اور انہیں بنیادوں پر کھڑی شخصیت کی زندگی جنت کی زندگی کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس اگر بچہ کسی وجہ سے ماں کی کمزوری بن جائے تو نتائج بالکل برعکس نکلتے ہیں۔ گو اس سارے عمل میں ماں کو اولین حیثیت حاصل ہے لیکن اس سے قطعی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ باپ اس عمل سے باہر ہے یا اس کا عمل دخل نہیں۔ بچہ کی اچھی پرورش اور تربیت ماں اور باپ کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اس میں اگر باپ کی شراکت نہ ہو تو ماں اکیلے شاید وہ جنت نہ دے سکے جو اصولاً ہر بچے کا حق ہے۔ والدین کی چپقلش خصوصاً ماں کے لئے ذہنی دباؤ کا سبب بنتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بچے کو وہ پیار اور توجہ نہیں دے سکتی جو بچہ کی آنے والی زندگی کے لئے انتہائی اہم ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ 'ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے' تو وہ بھی مرد کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت یعنی ماں ہے اور یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ہر کامیاب عورت اور کامیاب ماں کے پیچھے بھی عورت ہی ہے۔ ماں کے روپ میں۔ یہ اچھی اور کامیاب ماں آنے

والی ماؤں کو بھی تو جنت سے نوازتی ہے۔ یوں یہ سلسلہ چلا جاتا ہے اور دنیا و آخرت میں جنت عطا کرنے کا رتبہ صرف عورت ہی کے پاس ہے۔ جب ہم ''ماں کے پاؤں تلے جنت ہے'' کو صرف لفظی معنوں تک محدود رکھتے ہیں تو بڑی بوڑھی ماؤں کی خدمت واحترام میں پیش پیش ہوتے ہیں جو کہ بلاشبہ بہت ضروری ہے لیکن ہماری بیٹیاں بھی آنے والی مائیں ہیں۔ انہی بیٹیوں نے آنے والے کل میں مائیں بن کر ایک نئی نسل کو تیار کرنا ہے۔ لہٰذا یہ بیٹیاں یعنی آنے والے وقت کی مائیں اسی توجہ اور پیار کی مستحق ہیں جو ہماری آج کی مائیں ہیں۔

آج کل عدمِ تربیت کا ایک جواز یہ دیا جاتا ہے کہ ''وقت نہیں ملتا'' حقیقتاً وقت تو صدیوں سے وہی دن کے 24 گھنٹے ہیں دراصل ہماری ترجیحات بدل گئی ہیں۔ معاشی حالت سرفہرست ہو چکی ہے۔ اچھے اور بہتر معاشی حالات والے والدین خود تو اپنے بچوں کو وقت نہیں دیتے' لیکن انہیں اعلیٰ کھانا' اعلیٰ پہناوا اور بہترین قسم کے کھلونوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ شاید یہ اپنے 'بچوں کو وقت نہ دینے کا' احساس ندامت ہے جسے اعلیٰ کھلونوں سے 'Compensate' کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن یاد رکھئے کوئی کھلونا' کوئی کمپیوٹر آپ کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔

یورپی اقوام اپنی معاشرتی بہتری کی ایک بڑی قیمت چکا رہی ہیں۔ جو بظاہر نظر نہیں آتی۔ ماں باپ اور اولاد کے درمیان جذباتی وابستگی کی ایک خلیج حائل ہو چکی ہے۔ یہ خلیج امارت اور مادیات سے بھری ہوئی ہے۔ مادی وسائل بھرپور ہونے کے باوجود نئی نسل میں خودکشی کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جب والدین کے پیار اور محبت میں کمی رہ جائے تو ذہنی امراض یا مجرمانہ زندگی کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر یہ جراثیم کسی وجہ سے پنپنے نہ پائیں تو زندگی کا مقصد ''بے معنی'' لگتا ہے۔ تمام تر مادی اشیاء کی موجودگی بھی زندگی میں ''معنی'' پیدا کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

یاد رکھئے! ایک چھوٹا بچہ جس نے ابھی تک پڑھنا' لکھنا شروع نہیں کیا' وہ جو کچھ اس عمر میں سیکھ سکتا ہے' وہ اکثر اوقات بڑے ہو کر سینکڑوں کتابیں پڑھ لینے کے باوجود نہیں سیکھ پاتا۔ اِن کتابی علوم پڑھنے اور جاننے سے پہلے کے استاد ماں اور باپ ہوتے ہیں۔ اس عمر میں پرورش اور تربیت شخصیت کی عمارت کی بنیادیں ڈال دیتی ہے۔ مضبوط بنیادوں پر کھڑی عمارت طوفانِ مسائل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ طوفان مسائل جو زندگی کا حصہ ہوتے ہیں آتے رہتے ہیں لیکن مضبوط شخصیت کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔ یاد رہے کہ مضبوط شخصیت سے مراد مادی مضبوطی نہیں' وگرنہ یورپی اقوام میں شرحِ خودکشی یا شرح منشیات برائے نام ہوتے۔ لہٰذا ماں اور بچہ کا تعلق' بچہ کو دنیا میں ہی جنت دے سکتا ہے اور یہی بچہ بڑا ہو کر ماں کی خدمت سے آخرت میں بھی جنت پا سکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا حافظ غلام مرشد مرحوم، سابق خطیب شاہی مسجد، لاہور

علامہ اقبالؒ سے سعادت مندانہ ملاقاتیں

(مولانا) حافظ غلام مرشد تحریکِ پاکستان کے ان بلند مرتبت کارکنوں میں سے تھے جنہیں علامہ اقبال اور قائداعظم علیہم الرحمتہ کا اعتماد اور تقرب حاصل تھا۔ تحریکِ پاکستان کی حمایت میں جب جمعیت علماء اسلام کا قیام عمل میں آیا تو مولانا شبیر عثمانی کی علالت کے باعث قائداعظمؒ نے غلام مرشدؒ کو اس علماء اسلام کانفرنس کے افتتاحیہ خطبہ دینے کے لئے منتخب کیا۔ (مولانا) غلام مرشد نے پچاس سال تک لاہور میں درسِ قرآن کریم دیا۔ ذیل میں علامہ اقبالؒ سے ان کی چند ملاقاتوں کا احوال درج کیا جا رہا ہے جو انہوں نے قلم بند کرائی تھیں اور کئی عشرے پہلے فنون اور نقوش میں شائع ہوتی رہیں۔ (مدیر)

خاکسار کو علامہ اقبالؒ کی زیارت کا شرف اس تعلیمی زندگی میں حاصل ہو چکا تھا۔ جو اکتوبر ۱۹۱۴ء تک درس نظامی اور مولوی فاضل کے نصاب میں مہارت پیدا کرنے کے لئے گزرا جو پنجاب یونیورسٹی کا اس وقت مروجہ سلیبس تھا۔ اس کی تکمیل کے لئے میں نے کام کیا جس کی تدریس کا فرض یونیورسٹی نے اورینٹل کالج کے سپرد کیا ہوا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور دارالعلوم نعمانیہ ہند کے صدر مدرس (پرنسپل) مولانا غلام رسول صاحب گجراتی اور مدرسہ حمیدیہ کے پرنسپل مولانا محمد ذاکر صاحب بگوی اور مفتی عبداللہ ٹونکی کی خاص توجہ اور التفات سے دونوں کام پایہ تکمیل کو متوقع عزت کے ساتھ پورے ہوئے اور فاضلیت کی سندیں حاصل کیں اور ۱۵۔۱۹۱۴ء کو دورہ حدیث کی سند حاصل کرنے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی حریت پسندی کی وجہ سے اسیر مالٹا ہو گئے۔ وہ دورہ حدیث کے قابل اعتماد تلامذہ سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی بیعت لیتے تھے۔ سالانہ امتحان میں اللہ کے فضل و کرم سے نہ صرف فرسٹ رہا۔ بلکہ ایک ریکارڈ قائم کر دیا یہ مستندترین سندیں حاصل کرنے کے بعد اجمیر شریف میں جو نظام حیدر آباد (دکن) نے دارالعلوم قائم کیا اور جس کے وائس چانسلر نظام دکن کی طرف سے مولانا انوار اللہ مدارالمہام امور مذہبیہ تھے اور پرنسپل مولانا معین الدین تھے۔ علمائے خیر آباد میں مولانا عبدالحق خیر آبادی جو مولانا فضل الحق خیر آبادی جو جنگ آزادی میں گرفتار ہوئے اور جن کو دریائے شور کی سزا ملی اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ ان کی ساری علمی وراثت اور ہزاروں احترام کے قابل حضرت مولانا ابوالبرکات ٹونکی، انہوں نے فلسفہ قدیم، ہیئت، اقلیدس اور منطق کی تمام قلمی اور غیر قلمی کتابیں یونیورسٹی کے سپرد کر دیں۔ جو حیدر آباد (دکن) کے کتب خانے میں تھیں میں نے دو سال وہاں رہ کر عقلیات کے اس نصاب کو مکمل کیا اور سالانہ امتحان میں فرسٹ آیا۔ اور ممتحن اعلیٰ ابوالبرکات ٹونکی صاحب نے میرے پرچے پر یہ سنہری حروف رقم فرمائے کہ اگر امتحان کا قانون مقرر کئے ہوئے نمبروں سے زیادہ نمبروں کی اجازت دیتا تو میں اس طالب علم کو بجائے سو نمبروں کے ۱۱۰ (ایک سو دس) نمبر دیتا۔ وہاں سے فراغت کے بعد اپنے مرحوم والد کی اس وصیت پر عمل کیا، جو میری ایک سال کی عمر میں انہوں نے اپنے مرشد کامل خواجہ اللہ بخش صاحب تونسویؒ سے یہ کہا تھا کہ میں اپنے لڑکے کو انگریزی حکومت کے کسی محکمے میں خصوصاً فوج میں بھرتی نہیں کراؤں گا۔

اور آپ کے اس ارشاد کے مطابق کہ خواستہ حرام ناخواستہ حلال کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی حاصل کردہ تعلیم کا کسی پرائیویٹ درس گاہ میں درس دوں گا۔ چنانچہ پہلے سیال شریف ضلع سرگودھا میں جو ضیاء العلوم کے نام سے درس گاہ قائم تھی۔ حضرت خواجہ اللہ بخشؒ کے جانشین حضرت حامد میاں کے حکم کے مطابق درس دیا۔ پھر انہیں کے حکم سے سورکی، تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا میں اپنے مرحوم ومغفور کے وفات پا جانے کی وجہ سے ان کے عزیزان کی تعلیم کی تکمیل کے لئے وہاں درس دیتا رہا۔ اس درس گاہ کو اس وقت خدا نے بہت عزت بخشی کہ شمالی ہندوستان کے بہت سے طالب علم داخل ہوئے اور دورہ حدیث کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ یہاں رہ کر خلیفہ شجاع الدین مرحوم ومغفور کی ترغیب پر آل انڈیا مسلم لیگ کا ممبر ہوا اور جمعیت العلمائے ہند دہلی کی طرف سے صوبائی جمعیت کا صدر مقرر ہوا اور پنجاب خلافت کمیٹی کا وائس پریذیڈنٹ ڈاکٹر کچلو کی گرفتاری کے بعد منتخب کیا گیا۔ جس کے پریذیڈنٹ مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔ جو مسٹر محمود علی قصوری بیرسٹر کے والد ماجد تھے اور ملک لال خان مرحوم جس کے سکریٹری تھے۔ یہ کمیٹی ستم رسیدہ ترکوں کی حمیت وامداد کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اور جس گہری اور بدتر چال سے ٹرکی کا عروج ختم ہوا وہ ظاہر تھی۔ اسی انگریز نے خلافت کمیٹی کو ناکام بنانے کے لئے یہاں معززین کو انعامات اور خطابات کے لالچ دے کر خرید لیا۔

اور ان خرید شدہ بزرگوں نے سول اور ملٹری گزٹ میں ان کی طرف سے اس قسم کے مضامین شائع کرنے شروع کر دیئے کہ قریشیوں کے سوا اسلامی خلافت کا کوئی حقدار نہیں۔ یہاں تک کہ اس اخبار نے خود بھی ایسے افتتاحیئے اور شذرات لکھنے شروع کر دیئے جن کا عنوان ''الائمۃ من القریش'' ہوتا کہ پیغمبرؐ کا اعلان موجود ہے کہ میرے بعد خلیفہ اور امام قریشی ہوں گے۔ پنجاب کمیٹی کے موجودہ صدر نے مجھے یاد فرمایا کہ ہماری تحریک کو ناکام بنانے کی جو انگریز نے سازش شروع کی ہے کیا آپ اس روایت کا تجزیہ کریں گے۔ میری اطلاع دینے پر کمیٹی نے بھاٹی دروازہ کے باہر ایک پبلک جلسے کا اعلان کر دیا اور میں نے اللہ کی توفیق سے اس پبلک جلسے میں تقریر کی۔ یہ میری پہلی سیاسی تقریر تھی۔ اور اخبار زمیندار کے نمائندوں کے سوا دوسرے اخباروں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کا نمائندہ بھی شامل تھا اور مسلمانوں کا انگریزی اخبار مسلم آؤٹ لک' جو مولانا عبدالحق کی زیر قیادت نکل رہا تھا۔ اس کے نمائندے بھی شامل تھے۔ اسے تاریخی اجلاس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ خاکسار نے اس پرامن جلسے میں اس حدیث کا پورا تجزیہ کیا اور ثابت کیا کہ یہ حدیث نہ روایتاً صحیح ہے نہ درایتاً صحیح۔

ا۔ یہ الفاظ صحیح بخاری اور مسلم میں موجود نہیں اور جن صحیحین کے سوا جن بزرگ محدثین نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ ان کی سندوں کے جو سلسلے بھی بیان کئے ہیں۔ ہر سلسلے میں کوئی نہ کوئی بدترین کذب (جھوٹ) کا مرتکب ہے' روایت کا تو یہ حال ہے۔

۲۔ درایتاً کہ قرآن نے مسلمانوں کو اعلیٰ اقتدار امامت' امارت اور خلافت کی بشارت دی ہے۔ اس میں ہاشمیت اور

قریشیت کی کوئی تمیز نہیں (سورہ چوبیں' آیت پچپن' پارہ اٹھارہ رکوع تیرہ)اور جن بزرگ مسلمانوں نے قریشیت کو خلافت کی شرط قرار دیا ہے۔ جو اپنے دور میں بہت معزز و محترم محقق سمجھے جاتے تھے۔اور بڑی بڑی عقائد کی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ حضرت علامہ تفتازانی کی شرح مقاصد سے کون بے خبر ہے اور میر سید شریف جرجانی کی شرح مواقف سے اور حضرت شاہ ولی اللہ کی حجتہ اللہ البالغہ سے کون ناواقف ہے بلاشبہ انہوں نے اپنی کتابوں میں شرائط خلافت کے متعلق جو لکھا ہے۔ان شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ قریشی ہو مگر یہ حضرات خود یہ نظریہ اپنے دور کی غیر قریشی حکومتوں کے دوران میں کیوں نہ پیش کر سکے۔

(حجتہ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر ص ۱۱۱ جلد دوم)۔

۳۔ ان ترکوں کی شرافت اور دیانت کا وہ حال ہے کہ انہوں نے ترکی میں اپنے دور کے بہت بڑے مجاہد عثمان کے عہد میں حکومت عثمانیہ کی بنیاد رکھی اور اقتدار اعلیٰ کے مالک ہو گئے۔ مگر جب تک کہ حکومت عباسی کا دور قائم رہا۔ وہ انہیں خلیفہ تسلیم کرتے رہے اور سلیم الاول کے دور میں تمام اسلامی سلطنتوں نے ان کو خلافت کا اعزاز بخشا۔ یہ واقعہ مئی ۱۵۱۲ء کو پیش آیا۔عثمان کے اقتدار کی بنیاد ۲۷ ستمبر ۹۹ء کو پڑی........ پھر ان کے اسی اعزاز کی خاطر مسلمان اپنے جمعوں اور عیدین کے خطبوں میں انہیں کا نام لے کر ان کی فتح و کامرانی کی دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

اس پہلی سیاسی تقریر کے بعد علامہ اقبال نے اس خاکسار کو یاد فرما کر شاباش دی اور میری پورے مجمع کے سامنے یہ پہلی ملاقات تھی۔

(۲) دوسری اہم ملاقات کا شرف تقریباً سال بھر کے بعد ہوا۔ علامہ اقبال نے اس خاکسار کو علامہ سے والہانہ عقیدت مندی رکھنے والے مسٹر محمد دین تاثیر (جو بعد میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے) کے ذریعہ بلوا بھیجا' علامہ اقبال کو ڈاکٹر تاثیر سے پرخلوص محبت تھی اور اگر یہ کسی وجہ سے ان کے پاس نہ جاتے تو ان کو بہت بے چینی ہوتی تھی۔ خاکسار نے کناری بازار کی اونچی مسجد میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کو قرآنی ہدایات کا درس دینا شروع کیا ہوا تھا۔اور انہیں اجازت دے رکھی تھی کہ انہیں جو شبہات قرآنی تعلیم کے متعلق پیش آئیں۔انہیں درس کے اختتام کے بعد پیش کریں۔ چنانچہ انہوں نے ماسٹر عبداللہ چغتائی اور ڈاکٹر نذیر احمد پنشنر گورنمنٹ کالج کے ساتھ مل کر قرآن کریم کی کتابت کے متعلق سوال پیش کیا۔ خاکسار تقریباً ایک ہفتے تک اس سوال کا جواب دیتا رہا اس علمی گفتگو کا علم علامہ اقبالؒ کو ڈاکٹر تاثیر کے ذریعے ہو گیا اور اپنے حاضرین مجلس کے سامنے اپنے مخلص احباب کی موجودگی میں یہ بحث شروع ہو گئی۔ خاکسار نے پوری تفصیل کے ساتھ اس کا جواب عرض کیا۔

ا۔ قرآن کریم نے کتابت کے جتنے لوازم ہیں۔انہیں ذکر کر دیا ہے۔ جو آج تک تسلیم کئے جاتے ہیں۔قلبی خیالات و معلومات کو قلم کے ذریعے قلم بند کرنا (سورہ نمبر ۹۶ آیت نمبر ۴' ۵) یعنی جس خدا نے تم پر قرآن کریم ایسی انمٹ کتاب بھیجی ہے۔ اسے قلم بند کرنے کے لئے قلم بھی عطا فرمایا۔اور ان آخری مکمل

اور واضح ہدائتوں کو قلم بند کرنے کے لئے کاغذ سے بھی نوازا اور ان کے قلم بند کرنے کے لئے خوبصورتی کے لئے سیدھی لائنوں میں لکھنے کے اسباب بھی فراہم کر دیئے (سورہ نمبر ۵۲ آیت نمبر ۲۔۳ کتاب مستور فی رق منشور) اور ان انمٹ ہدایات خداوندی کہ تمہیں پوری طرح پڑھانا اور یاد کرانا ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان کو ترتیب وار لکھوانا اور تفصیلات بیان کرنا بھی ہے (سورہ نمبر ۷۵ آیت نمبر ۱۷۔۱۸۔۱۹) اسی ''رق منشور'' کی تفسیر ایک ایسے لفظ سے کی جو آج تک مروج ہے قرطاس ابجد (سورۃ نمبر ۶ آیت نمبر ۷)۔

۲۔ قیصر و کسریٰ وغیرہ کی حکومتوں نے جو کھلی تجارت کی تحریری اجازت جو حضرت ہاشم کے چاروں بیٹوں کو دے رکھی تھی وہ بھی قلموں سے لکھی ہوئی تھی اور اس دور کے مروجہ کاغذوں پر لکھی ہوئی تھی اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو نبوت و رسالت سے نوازا جانے سے پہلے بیس برس کی عمر میں بنی قیس اور بنی کنانہ میں جو جنگ ہوئی جسے حرب فجار کہتے ہیں۔ اس کے بعد جو معاہدہ طے پایا تھا۔ جو تاریخ میں حلف الفضول کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ بھی قلم سے لکھا گیا تھا۔ اس معاہدے میں آپؐ نے نہ صرف شرکت فرمائی۔ بلکہ اس معاہدے کا مضمون بھی تیار فرمایا۔ جس کی دو شقیں بہت مشہور ہیں۔ فریقین میں ہر ایک فریق جو حرب فجار میں شامل ہوئے تھے وہ مظلوم کی حمایت کرے اور دوسری شق اس معاہدے کو توڑنے والے اور ظلم و ستم کرنے والے کو مکے میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔ آپؐ نے رسالت اور ختم نبوت سے نوازے جانے کے بعد کئی بار اس معاہدے کا تذکرہ فرمایا۔ نہ صرف تذکرہ فرمایا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ ان شرائط پر آج بھی اگر کوئی مجھ سے معاہدہ کرنا چاہے تو میں تیار ہوں (طبقات ابن سعد) پھر جب مکہ معظّمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ تو وہاں کے امن پسند قبائل سے تحریری معاہدے کئے اور صلح حدیبیہ کے معاہدے کو کون نہیں جانتا جو ۶ ھ میں ہوا۔ یہ بھی کاغذ پر تحریر تھا۔ پھر صلح حدیبیہ دو درجن کے قریب کسریٰ و قیصر اور دوسرے سلاطین کو گرامی نامے لکھے جن میں ان کو اسلام کی دعوت دی ان کے لئے تو کاغذ مل گیا۔ نہیں ملا تو قرآن کے لکھنے کے لئے۔ نیز حضورؐ کی تشریف آوری سے قبل جب تمام عرب کا ایک بڑا اجتماع حج کے موقع پر ہوا۔ جس میں زمانہ جاہلیت کے قصیدوں کا انتخاب کیا گیا۔ سات قصیدوں کا انتخاب کیا گیا جن میں پہلا قصیدہ امراؤالقیس کا ہے۔

۳۔ علامہ ابن ندیم نے اپنی کتاب ''الفہرست'' میں اپنے پہلے مقالے کے پہلے فن میں ایک عنوان لغات الامم من العرب و العجم و اکلامہا وانواع خطوطہا واشکال کتابات ہا قائم کیا۔ جس میں اس نے ثابت کیا ہے مختلف حالتوں میں اور سائزوں میں ہزاروں سال سے قسم قسم کے کاغذات موجود تھے۔ ان میں مصر کے ترقی یافتہ کاغذ کی نوعیت پر اچھی بحث کی ہے۔ ایرانیوں اور رومیوں نے اپنی ذلیل ترین شکستوں کا انتقام لینے کے لئے اسلام کا لباس اوڑھ کر اس قسم کی حدیثیں وضع کرنی شروع کر دیں کہ عام لوگ ان متضاد روائتوں سے متاثر ہو کر حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خاتم الکتب قرآن مجید کی عظمت ان کے دلوں سے اٹھ جائے۔ کیونکہ ان کو جو شکست

ہوئی قرآن کی بدولت ہوئی۔ چنانچہ سب سے زیادہ جو حدیث مستند ترین کتابوں میں آئی وہ یہ ہے کہ حضورؐ کے وصال تک کوئی بھی حصہ قرآن کا جمع نہیں ہوا۔ اور انہیں زیدؓ ابن ثابت کے ذریعے مشہور ہوا کہ آپ کے دور میں قرآن پاک اپنے طور پر بعض صحابہ کرام نے ہڈیوں پر، چیتھڑوں پر، پتوں پر اس کے کچھ حصے لکھوار کھے تھے، جو سب سے پہلے جنگ یمامہ میں حفظ قرآن کی نعمت سے مالا مال ہوئے تھے۔ حفاظ وسیع پیمانے پر اس جنگ میں قتل ہوئے اور ان محدثین کے قول کے مطابق انہیں قرآن کریم کے مٹ جانے کا خطرہ لاحق ہوا؛ حضرتؓ نے جمع قرآن کی تجویز حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کی جو رد و قدح کے بعد منظور ہوئی۔ اور حضرت زید ابن ثابت انصاری کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی، جو اپنے طور پر قسم قسم کی لکھی ہوئی تحریریں پیش کریں اور ان کی نگرانی میں قراطیس بھی مل گئے یہی نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے اور حضرت عمرؓ کی نگرانی میں رہا۔ انہوں نے وفات کے وقت اپنی صاحبزادی ام المومنینؓ حفصہ کے سپرد کیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب عثمانؓ کو علم ہوا۔ کہ لوگوں نے اپنے طور پر بھی قرآن کے بعض حصے اپنی خود ساختہ تفسیروں کے ساتھ بنا کر لکھ رکھے ہیں۔ لہٰذا حضرت ام المومنین حفصہؓ سے قرآن کا مستند نسخہ منگوا کر ایک بارہ آدمیوں کی کمیٹی میں پیش کر دیا اور حکم جاری کیا کہ جس جس کے پاس جو بھی قرآن کا حصہ لکھا ہوا ہے۔ وہ اس کمیٹی کے سامنے پیش کرے۔ پھر اس معیار پر جن کی اپنے طور پر تحریر کی ہوئی آیتیں اور تفسیریں منطبق نہ ہوئیں تو انہیں جلا کر راکھ کو دفن کر دیا اور اس مستند نسخے کی متعدد مستند نقلیں کروا کر اپنی سلطنت کے اسلامی ممالک کے ہر صوبے میں بھیج دیں اور گورنروں کو ہدایت کی کہ جو بھی عالم قرآن کے درس دینے پر متعین ہو۔ وہ اس نسخے کو پیش نظر رکھے اور اپنی وفات تک قرآن حکیم کے ان مستند نسخوں کو مدرسین کی تشریحات سے پاک رکھو اور اگر تم بضرورت تشریح کرو تو ان تشریحات کو قرآن حکیم کا جزو نہ بننے دو۔

ڈاکٹر اقبالؒ نے اس خاکسار کا امتحان لینے کی غرض سے تاریخی شہادت طلب فرمائی جس کے جواب میں خاکسار نے یہ عرض کیا کہ قرآن کریم کی جمع اور ترتیب کو قرآن کے بدترین مخالف بھی تسلیم کرتے تھے: جن ہدایات کو یہ شخص یعنی سرکار دو عالم ﷺ ہدایات خداوندی کے نام سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ درحقیقت ہماری نظروں میں پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں اس نے لکھوالیا ہے اور جو صبح و شام اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں۔ (سورۃ نمبر ۲۵ آیت نمبر ۵ پارہ ۱۹ رکوع ۱۴) اور اس تاریخی واقعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب مختلف ممالک کی طرف سے حضور ﷺ کی خدمت میں وفدوں کی شکل میں وفد آئے اور ان میں سے ایک ثقیف کا وفد تھا۔ سرکار دو عالمؐ اس وقت قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپؐ نے اپنا فرض تلاوت ختم فرمایا۔ تو ان سے معذرت کی کہ تمہیں میرے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے انتظار کرنا پڑا جب میں اس قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتا ہوں اور جب تک اس حصے کو ختم نہ کرلوں میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ چنانچہ تم سے زیادہ تعداد میں لوگ مسجد میں قدیم ترین اور مخلص ترین مسلمان بھی انتظار میں تھے۔ وفد ثقیف نے گرویدگی اور محبت سے قرآن

پاک کی روزانہ تلاوت کے متعلق پوچھا۔ آپ کی عادت پوچھی؟ تو فرمایا' ایک دن سورۃ فاتحہ سے شروع کر کے سورۃ توبہ کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور چوتھے دن سورۃ بنی اسرائیل سے شروع کر کے سورۃ الفرقان کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں' اور پانچویں روز سورۃ شعرا سے شروع کر کے سورۃ یٰسین کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور چھٹے دن سورۃ والصافات سے شروع کر کے سورۃ الحجرات کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور ساتویں دن سورۃ ق سے لے کر سورۃ والناس کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں۔ یہ بے مثل قرآت صدیوں تک علماء کی نظر میں فہمی بشوق کے نام سے مشہور تھی۔ آپ (اقبال) کے دریافت فرمانے پر خاکسار نے عرض کیا کہ اس بے مثل قرآت کا تذکرہ صحاح ستہ میں سنن ابوداؤد میں موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ ان روایات کا کیا بنے گا۔ جن میں بڑے زور شور سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی جمع وترتیب کا ولولہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں جنگ یمامہ میں بہت سے قاریوں کے شہید ہونے سے پیدا ہوا۔ خاکسار نے گزارش کی کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں عرض کروں گا کہ یہ روایات بھی مسلمانوں کو قرآن کریم سے منحرف کرنے کے لئے گھڑی گئی تھیں۔ بڑے زوردار الفاظ میں یہ اعلان موجود ہے کہ یہ انمٹ حقیقت اور ناقابل تردید صداقت ہے کہ صرف ہمیں نے اس قرآن کو اتارا ہے جو قیامت تک انسانوں کو ان کے فرائض کی یاد دہانی کراتا رہے گا۔ اور یقیناً ہم ہی اس کی قیامت تک حفاظت کرتے رہیں گے اور عرض کیا کہ اس قسم کی احادیث قرآن کے مقابلے میں کون پیش کر سکتا ہے سوائے اس کے کہ فریب کارانہ

فریب کارانہ اور ابلیسیانہ شکل میں ایسی حدیثیں وضع کریں اور ہمارے سادہ لوح انسان ان پر بحثیں کریں۔ کسی میں حضرت ابو بکرؓ کی منقبت ہو۔ کسی میں حضرت علیؓ کی اور حدیثیں گھڑنے والے ان دونوں کے لئے متضاد حدیثیں وضع کرتے تھے' مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو حیرانگی میں ڈالتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے چھ برس تک اس قسم کی احادیث کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس لئے ان کے دور میں قرآن حکیم تھا اور جگہ جگہ اس کی ہر قسم کی تعلیم کا انتظام تھا۔ وہاں قرآن حکیم نے جن اوامر اور نواہی کی کوئی خاص کیفیت' کمیت' ہیئت' اور وضع اور شکل متعین نہیں فرمائی اور حضورﷺ کو حکم دے دیا کہ جو ان اوامر اور نواہی کی تفصیلات حالات کے مطابق آپ چاہیں متعین فرما دیں اور آپ کے متبعین کا فرض ہے کہ اس اسوہ حسنہ کی تعمیل کریں۔ ہاں اگر آپ کے جانشین اپنی مجلس شوریٰ کے ساتھ مل کر کچھ تبدیلی کرنا چاہیں' تو تبدیلی کر سکتے ہیں جیسے خود حضورؐ نے مال غنیمت کی تقسیم میں بدر سے لے کر حنین تک متبادل صورتوں میں تقسیم کیا۔ محدثین کے اسی جمع وتدوین کے کارنامے جو مسلمانوں کی محض سلف صالحین کی محبت کی وجہ سے سرانجام پائے وہ آخر پہلی دفعہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذریعہ پھر اس جمع وتدوین کے سلسلے میں جب خارجی اور رافضی کے دو متضاد فرقے پیدا ہو گئے' جو افتراق سے قبل ان مسلمانوں کے قتل عام کا موجب بنے جو صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان میں سے دو جنگیں جنگ جمل اور جنگ صفین کے نام سے مشہور ہیں' ان دونوں جنگوں میں تقریباً نوے ہزار آدمی قتل ہو گئے۔ اور جب ان کی منشا کے

خلاف صلح ہوگئی۔ جو ان کے مشن کے خلاف تھی وہ دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ حمایت کرنے والے شیعہ کہلائے اور شدید ترین مخالفت کرنے والے خارجی پھر ان کی آپس میں جنگ ہوئی، جسے جنگ نہروان کہتے ہیں۔ اور تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان، مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور وہ اپنے تفرقے میں کامیاب ہوگئے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں جو احادیث کی صحت و عدم صحت کی منظم کوشش شروع ہوئی وہ بھی بے وقت ہونے کی وجہ سے ناکام رہی۔

(۳) علامہ اقبال مغفور نے اپنا خاص قاصد بھیج کر فوری طور پر پہنچنے کا حکم دیا۔ جب یہ خاکسار اس حکم کی تعمیل میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں پہنچا۔ دیندار علماء، وکلاء مخلص احباب، جن میں جج صاحبان بھی موجود تھے۔ خاص طور سے جسٹس دین محمد صاحب موجود تھے ان دنوں ان کے عقیدت مند دوست اور خدام ۱۹۲۶ء کے الیکشن کے لئے آپؒ کو پنجاب کونسل کی لاہور سیٹ سے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ اتنے بڑے بزرگوں کے اجتماع کو دیکھ کر ایک گونہ حیرت بھی ہوئی۔ اور ایسے وقت میں یاد فرمائی پر تعجب بھی ہوا میرے جانے پر ان بزرگوں کے مجمع کو دو حصوں میں بٹا ہوا دیکھا۔ جو قرآن کریم کی بعض آیات کے منسوخ ہونے پر بحث فرما رہے تھے۔ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ علامہ نے پیار سے فرمایا **"بدو مولوی میرے پاس آجاؤ اور تم بھی حصہ لو"** میں نے دونوں طرف کے اکابر کی طرف اشارہ کرتے عرض کیا کہ آپ اور ان بزرگوں کی موجودگی میں اس نوعمر خاکسار کو جس کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال ہے۔ اتنے اہم مسئلے میں کیسے حصہ لے سکتا ہے لیکن آپؒ نے فرمایا کہ "میں حکم دیتا ہوں کہ آپ بھی اس سلسلے میں اظہار خیال کریں۔ خاکسار نے گزارش کی کہ آپؒ کو اور ان بزرگوں کو معلوم ہے کہ قرآن کریم میں نسخ آیات کا ذکر ضرور موجود ہے بلکہ تبدیلی آیات کا بھی (سورۃ نمبر ۴۵ آیت نمبر ۲۹ پارہ ۲۵ رکوع ۲۰) تحویل و انتقال، ان معنوں میں بھی ان دونوں بزرگ جماعتوں کو معلوم ہے وراثت کی کتابوں میں تناسخ المیراث کا ایک مستقل باب ہے۔ یعنی ترکے کا انتقال غالباً اسی معنی کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے ہندوؤں میں ایک عقیدہ آواگون کا سلسلہ جاری ہے۔ تیسرا معنی ازالہ و محو، مٹا دینا (سورۃ نمبر ۲۲ آیت نمبر ۵۲ پارہ ۷ رکوع ۱۴) آیات خداوندی کا لفظ بھی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً مناظر قدرت اور تاریخی قوموں کے آثار قدیمہ (سورۃ نمبر ۱۷ آیت نمبر ۲۲ پارہ ۱۵ رکوع ۲) و (سورۃ نمبر ۱۶ آیت نمبر ۱۱۔۱۲۔۱۳ وغیرہ) و (سورۃ نمبر ۲۶ آیت نمبر ۸ پارہ ۱۹ رکوع ۱) و آیت نمبر ۲۷ رکوع ۴، و آیت نمبر ۱۰۳ رکوع ۵، و آیت نمبر ۱۲۱ رکوع ۶ و آیت نمبر ۱۳۹ رکوع ۷ و آیت نمبر ۱۵۸ رکوع ۸ و آیت نمبر ۱۷۴ رکوع ۹ و آیت نمبر ۱۹۰ رکوع ۱۰) سوۃ شعرا آیت نمبر ۱۲۹ سورۃ نمبر ۲۶) یہ آیت مثالیں ہیں۔

سلسلہ رسالت کے شروع ہونے سے لیکر آخر تک جو خدا کی طرف سے نبیوں کی وساطت سے قوموں کو ہدایات دی گئیں، چنانچہ حضرت آدمؑ کو جب وحی نبوت کے ذریعے چند انمٹ ہدائتیں دیں۔ تو ان کی تعبیر آیات اللہ سے کی (سورۃ نمبر ۲ آیت نمبر ۳۹ پارہ پہلا رکوع ۴ (و) سورۃ نمبر ۷ آیت نمبر ۳۵ پارہ ۸

رکوع ۱۱ (و) سورۃ نمبر ۹ آیت نمبر ۱۰۳ پارہ ۹ رکوع ۳) اور حضرت نوحؑ کے تذکرے میں (سورۃ نمبر ۹۱ پارہ ۱۱ رکوع ۱۲)۔

آپؐ کی تشریف آوری سے قبل انمٹ ہدائتیں اللہ پاک کی طرف سے نبیوں کے ذریعہ سے دی گئیں۔ وہ تو ان کی وفات کے بعد ان کے خودغرض، دین فروش مذہبی پیشواؤں نے دولت مندوں اور حکومتوں سے پیسے بٹورنے کے لئے فراموش کر دیں اور عوام کے دلوں سے ان کے نقش و نگار مٹا دیئے۔ ان احکام خداوندی کی جگہ اپنی پیشوائیت کو قائم رکھنے کی غرض سے کچھ احکام خود گھڑ لئے۔ ان مذہبی پیشواؤں کے کے مخترع احکام کی تعبیر بھی آیات ربانی سے کی اور انہیں آیات اللہ کہنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر خدا کے پیدا کئے ہوئے بعض جانوروں اور زمین کی پیداوار کے ایک حصے کو اپنے خودساختہ معبودوں کے لئے مخصوص کر دیا اس طرح اپنی اولاد خصوصاً بعض بیٹوں کو قتل کر دینے کے احکام جاری کر دیئے اس سے دیوی اور دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ یہ ہدائتیں تھیں۔ اسی طرح بعض چار پاؤں پہ سواری یا ان سے کام لینے کو ممنوع قرار دے دیا اور بعض مردار جانوروں کا گوشت کھانا حلال ٹھہرا دیا اور بعض جانوروں سے استفادہ عورتوں کے لئے حرام کر دیا اور مردوں کے لئے حلال کر دیا (سورۃ نمبر ۶ آیت نمبر ۱۴۱۔۱۳۷ پارہ ۸ رکوع ۳) اس قسم کے افترا پردازانہ احکام کا تذکرہ (سورۃ نمبر ۵ آیت نمبر ۱۰۳ پارہ ۷ رکوع ۴) اسی طرح یہودیوں کی اصلاح کے لئے وقتی طور پر جو حکم جاری کیا کہ ناخن دار جانوروں اور گائیوں اور بکریوں کی مخصوص چربیوں کا استعمال تمہارے لئے حرام ہے (سورۃ نمبر ۶ آیت نمبر ۱۴۷ پارہ ۸ رکوع ۵ (و) سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۱۰۷ پارہ ۶ رکوع ۲) اس قسم کے وقتی احکام کو بھی مذہب کا دائمی حکم ٹھہرا دیا۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ منسوخ شدہ آیتوں سے قرآن کی آئتیں مراد نہیں، بلکہ پہلے مذہبی پیشواؤں کے من گھڑت احکام کا نسخ یعنی ملیامیٹ کرانا مراد ہے اور جن احکام خداوندی کو انہوں نے اپنی دین فروشی کے ماتحت دین فروشی کی غرض سے یعنی مذہبی سیادت کو قائم رکھنے کی غرض سے اپنے عوام کے دلوں سے ان کے نقوش تک مٹا دیئے تھے۔ میری سمجھ میں یہی آتا ہے اور قرآن نے انمٹ اور ابدی احکام جن کے نقوش تک یہ مذہبی پیشوا مٹا چکے تھے۔ انہیں صحیح شکل وصورت میں کر دیا جنہیں تمام پیغمبر پیش کرتے رہے تھے۔ سب سے زیادہ زور قرآن نے شرک کے مٹانے پر دیا۔ جسے تمام پیغمبر اپنے اپنے وقت میں مٹاتے رہے وہ شرک شفاعت میں ہو یا عبادت میں ہو یا حکم میں ہو قرآن نے سارا زور اسی پر دیا ہے۔ قرآن نے ان کی خودساختہ اور ان کے مذہبی دین فروش پیشواؤں کے احکام جو خدا کے نام پر پیش کرتے تھے جن سے وہ بگڑ کر معاذ اللہ آپؐ پر افترا پردازی کی تہمتیں لگاتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے (سورۃ نمبر ۱۶ آیت نمبر ۱۰۱ پارہ ۱۴ رکوع ۲۰) کہ جب بدلتے ہیں ہم کسی حکم کو ان کے خودساختہ مذہبی احکام کی جگہ تو وہ چیخ چیخ کر یہ پکارتے ہیں'' کہ تو فقط افترا پرداز ہے اگلی چار آیتوں میں ان کی افترا پردازیوں کی مزید تفصیل فرمائی ہے اور (سورۃ نمبر ۲۲ کی آیت نمبر ۵۲ پارہ ۱۷ رکوع ۱۴) بڑی وضاحت کے ساتھ اعلان فرما دیا کہ ہم نے تم سے پہلے جب کبھی اپنا رسول بھیجا اور اس نے اپنی

قوم کو میری آیتوں کے سنانے کا سلسلہ شروع کیا' تو شیطان سیرت مذہبی پیشواؤں نے آیات کے سلسلے میں اپنے مروجہ احکام کی آڑ لے کر ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کیں۔لیکن ہم نے ان کی رکاوٹوں کو ملیا میٹ کر دیا اور پھر اپنے رسول کے ذریعے دی ہوئی انمٹ ہدایتوں کو لوگوں کے دلوں میں مستحکم اور مضبوط منقش کر دیا اور پارہ پہلا سورۃ دو کے پہلے رکوع کی پہلی آیت میں مسلمانوں کو حضورؐ کے حق میں ذو معنی الفاظ استعمال کرنے کے لئے سختی سے مخالفت فرمائی' بلکہ اس کو کفر قرار دیا۔رکوع کی دوسری آیت میں یعنی ۱۰۵ میں اہل کتاب اور مشرکوں کو بد ترین دشمنی اور افترا پردازی سے فراموش کرائے ہوئے کسی حکم کو فراموش ہو جانے کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔تو ان سے بہتر یا ان جیسا حکم تمہارے ذریعے لوگوں کیسامنے پیش کرتے ہیں۔یعنی ان کے افترائی احکام میں جو کسی موزوں شکل میں قائم رکھے جاسکتے تھے انہیں اچھی سے اچھی شکل دے کر پیش کر دیتے اور جو کسی ہیئت صورت' کیفیت کی تبدیلی کے قابل نہیں ہوتے۔انہیں سرے سے مٹا کر ان کی جگہ بہتر سے بہتر احکام صادر فرما دیتے ہیں۔ خاکسار کی یہ تقریر میر محفل کے احترام کی وجہ سے نہایت خاموشی سے سنی گئی۔ مگر آپ (اقبال) نے فرمایا کہ آیات قرآنی کے نسخ کا مسئلہ کیسے پیدا ہو گیا؟ خاکسار نے عرض کیا کہ نسخ پر مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں خود ان میں سے علمائے کرام کے ایک فریق نے یہ تسلیم کیا ہے ان آیات میں ان احکام کی نسخ کا ذکر ہے جو پہلی امتوں کے پاس من گھڑت مذہبی احکام یا وہ فروعات ہیں جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔جن کا تذکرہ آٹھویں یا پانچویں پارہ کی سابقہ آیات میں عرض کیا گیا ہے۔اس لئے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے۔جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں قرآن نے پیش کی ہے (سورۃ نمبر ۳ آیت نمبر ۴۹ پارہ ۳ رکوع ۱۲) میں نے اپنی بساط کے مطابق اس مسئلے پر مسلمانوں کی جو کتابیں پڑھی ہیں۔جن میں مشہور کتاب' الناسخ و المنسوخ' الامام ابوجعفر النحاس المتوفی ۳۳۸ ہجری مطبوعہ مصر (۱۳۲۳) اس کے بغور مطالعہ کرنے سے یہ چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۔ پورے قرآن میں کسی آیت کو دوسری آیت سے منسوخ کرنے کا تذکرہ تک نہیں۔

۲۔ کسی آیت کے منسوخ ہونے سے متعلق یا ناسخ ہونے کے متعلق کوئی ایسی روایت (نہیں جو) صحیح ہو۔

۳۔ صحابہ کرام کے نام پر موقوف روائتیں موجود ہیں' لیکن متضاد۔

۴۔ پہلے پارے کی نسخ کی آیت کے ساتھ نسیان آیات کا بھی ذکر ہے جس کی خود قرآن کریم نے بڑے زور دار الفاظ میں تصدیق کر دی ہے۔

خدا کی پڑھائی ہوئی آیتوں کے متعلق حضورﷺ کا نسیان کا شکار ہونا خود قرآن کریم کے اعلان کے خلاف ہے (سورۃ ۸۷ آیت نمبر ۶ پارہ ۳۰ رکوع ۱۲)۔

۵۔ منسوخ آیات قرآنی معاذ اللہ کی مخترع تعداد میں بے حد اختلاف ہے چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے (سورۃ احزاب ۳۳) سورۃ بقرہ کے برابر تھی' حالانکہ سورۃ بقرہ کی آیتوں

کی تعداد ۲۸۶ ہے اور سورۃ احزاب کی صرف ۷۳ ، جو سیکڑوں سے متجاوز ہو جانے کے بعد پھر گھٹنی شروع ہوئی۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب الاتقان میں ان کی منسوخ آیتوں کی تعداد بیس متعین کی اور انہوں نے اسے اپنی کتاب میں منظم شکل میں پیش کیا۔ستائیسواں حصہ ۳۱۴، بعض بزرگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے فرمایا کہ جابر کافروں کے ظلم وستم سہتے ہوئے صبر کرنے کا حکم دیا تھا ان ایک سو چوبیس آیتوں کو آیت سیف نے منسوخ کر دیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ بعض بزرگ اس کار خیر میں عجیب بات لکھ گئے کہ (سورۃ نمبر ۲ کی آیت نمبر ۱۹۹ پارہ ۹ رکوع ۱۴) تین فقروں کی جو آیت ہے۔ ان میں سے دو فقرے منسوخ اور درمیانہ فقرہ غیر منسوخ۔

۶۔ نسخ کا سوال آیات کے تضاد پر موقوف ہے اور قرآن کریم نے تضاد کی پوری نفی کر دی ہے۔ بلکہ خود قرآن نے تضاد نہ ہونے کو اپنے کلام کی دلیل بنایا ہے (سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۸۲ پارہ ۵ رکوع ۸) اور تضاد کے متعلق علم ادب و علم منطق کا یہ فیصلہ ہے:

در تناقض ہشت وحدت شرط داں
وحدت موضوع و محمول ومکاں
(مبتداوخبر)
وحدت شرط و اضافت جزو کل
قوت و فعل است در آخر زماں

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اعلان فرمایا کہ اس اہم مضمون کی تکمیل آئندہ ملاقات میں ہوگی (یعنی آٹھ دن کے بعد) بعض جدید وقدیم تعلیم یافتہ بزرگوں نے عرض کیا کہ ہمیں چند سوالات پوچھنے کا موقع دیا جائے۔تو آپؒ نے فرمایا کہ اس کا بھی اسی دن موقع ملے گا۔یعنی آٹھ دن کے بعد:

سب سے پہلے ان بزرگوں نے اپنے افکار اور سوالات کا تذکرہ کیا۔اس کے بعد مجھے ارشاد فرمایا جس پر میں نے عرض کیا کہ ان بزرگوں کے ارشادات زیادہ تر اس بحث کے متعلق ہیں جو ہمارے پیشواؤں نے کتابیں لکھی ہیں، ان پر مبنی ہیں اور کسی بزرگ نے کسی آیت قرآنی کے نسخ کے متعلق نہ تو قرآن کریم کی کسی آیت کو پیش فرمایا ہے اور اپنی عقیدت مندی کی بنا پر غیر معصوم بزرگوں کے اقوال درج کئے ہیں ایک طرف تو وہ متضاد ہیں جو کسی ایک آیت کو منسوخ کہہ رہا ہے دوسرا اس کو ناسخ بتلا رہا ہے جس کی شہادت میں خاکسار اپنے ساتھ کتاب' الناسخ و المنسوخ' مصنفہ ابوجعفر نحاس متوفی ۳۳۹ ہجری اور امام ابن خذیمہ کی کتاب' الناسخ والمنسوخ مطبوعہ مصر لے کر گیا تھا۔ان کے صفحات پڑھ کر سنائے، جن میں سے ایک ایک آیت کے نسخ کے سلسلے میں بڑے بڑے اماموں کے پانچ پانچ اقوال ہیں جن پر ایک جگہ خود علامہ ابن نحاس نے یہ لکھا کہ کسی آیت قرآنی کو اس وقت تک منسوخ نہیں کہا جا سکتا جب تک کوئی دوسری آیت قرآنی جسے ناسخ قرار دیا جاتا ہے، اس کی ہر حیثیت سے متضاد نہ ہو (کتاب الناسخ والمنسوخ (۱۲) اور یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی دو آیتوں کا ملنا محال ہے اور قرآن اسی عدم تضاد کو انمٹ احکام خداوندی کا مجموعہ ہونے کی دلیل ٹھہراتا ہے (سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۸۲ پارہ پارہ نمبر ۴ رکوع ۸) اور ہمارے ان بزرگوں نے جن غیر معصوم بزرگوں کی کتابوں کو اعتماد کی سند دے رکھی ہے ان میں سے امام بخاریؒ کی ایک حدیث نقل کی ہے جو بظاہر موقوف ہے۔

حضرت عمرؓ پر وہ پیش فرمائی ہے۔ اگر اس کو مرفوع بھی فرض کیا جائے تو خود اس کے دونوں جملوں میں تضاد ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ شادی شدہ زنا کاروں کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد ان کو سنگسار کر دیا جائے۔ لیکن میں اس پر بھروسا رکھ کر قرآن میں لکھوانا چاہتا ہوں اور نہ اس کے لکھنے کو حضورؐ نے پسند فرمایا۔ اس تضاد کی موجودگی میں اس غیر یقینی روایت کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے اور قرآن میں موجود بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ جب قرآن کریم کی کوئی آیت یا سورت حضورؐ پر نازل ہوتی تھی تو ایک طرف تو معجزانہ رنگ میں حضورؐ کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ دوسری طرف حضورؐ اسی قرآن کریم کی کتابت کرنے والوں میں سے جو بزرگ ڈیوٹی پر موجود ہوتے تھے ان سے لکھوا لیتے تھے۔ حق یہ ہے کہ جب مکہ معظّمہ میں سرکار دو عالم پر سورۃ نمبر ۶ بیک وقت نازل ہوئی جس کی آیتیں ایک سو چھیاسٹھ ہیں اور رکوع بیس ہیں، اس وقت حضورؐ نے قرآن کریم کے جو کاتب ڈیوٹی پر تھے۔ اسی ترتیب سے پڑھ کر جس طرح خداوند کریم نے پڑھائی تھی لکھوا دی ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں یہ موجود ہے کہ یہودی حضورؐ کی عدالت میں شادی شدہ زنا کار مرد اور عورت کو لائے اور ان کا جرم ثابت ہو گیا کیونکہ حضورؐ نے ہر مذہب کی رعیت کو اجازت دے رکھی تھی۔ کہ ان کے دیوانی اور فوجداری مقدمات کا ان کے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا، تو حضورؐ نے پوچھا کہ تمہاری مذہبی کتاب تورات میں اس جرم کی کیا سزا لکھی ہے تو انہوں نے غلط بیانی سے کام لے کر کہا کہ ہم اس کو کوڑوں کی سزا دیتے ہیں اور اسے رسوا کرتے ہیں۔ اسی محفل میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ موجود تھے۔ جو پہلے پکے یہودی عالم تھے۔ ان کی اس غلط بیانی کو وہ برداشت نہ کر سکے اور عرض کیا کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ تورات منگوائی گئی اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اس میں سے رجم کی آیت پڑھ کر سنائی۔ اس ثبوت کے مل جانے کے بعد حضورؐ نے تورات کی آیت رجم کے مطابق ان کو سزا دی۔ آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان بزرگوں نے جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں ان میں کوئی ایک حدیث مرفوع صحیح تک موجود نہیں ہے۔ چہ جائیکہ قطعی ہو اور خود ان بزرگوں نے اپنے غیر معصوم مذہبی پیشواؤں کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ انہیں میں یہ درج ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اور نہ کسی آیت نے اس کو منسوخ کیا یعنی قرآن کی کسی آیت نے کسی آیت کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ کتابی اور غیر کتابی غیر مسلم جماعتوں کے گم راہ کن زر پرست مذہبی پیشواؤں نے اپنے من گھڑت احکام کو خدا تعالیٰ کے احکام کا نام دے رکھا تھا۔ اور دیدہ و دانستہ خدا پر افترا باندھتے تھے۔ جہاں تک جن انمٹ احکام کی خداوند کریم نے ہر رسول کے ذریعے ہر مذہب کی تعلیم دی تھی وہ بھی انہوں نے فراموش کر دی۔ چنانچہ سب سے بڑا حکم جو ہر نبی کے ذریعے خداوند کریم نے دیا وہ توحید فی الصفات توحید فی العبادت اور توحید فی الحکم کا حکم دیا تھا۔ وہ انہیں ایسا فراموش ہوا۔ کہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدا تعالیٰ کے صفات و عبادت و حکم میں شریک کر دیا (تفسیر اتقان تصنیف امام سیوطی شافعی ۸۷۸ ہجری و مطبوعہ ۱۲۸۰ھ مطبع احمدی دہلی صفحہ ۳۱۲۔۳۱۳۔۱۳۴) میں موجود ہے۔

اس گفتگو کے بعد مجلس برخاست ہوئی۔

(جاری ہے)

(۵) ۲۶ کے الیکشن میں خاکسار بھی دوسرے مخلص ورکروں کی طرح شامل تھا تقریباً ہر انتخابی جلسے میں جہاں ملک لال دین قیصر لکے زئی اپنی شاعرانہ سحر بیانی سے ان محفلوں کو گرما دیتے تھے۔ خاکسار بھی اپنی استطاعت کے مطابق ان محفلوں کو آرائیں اور کشمیری برادری کے سوالات سے بالاتر رہنے کی تلقین کرتا تھا میں اس الیکشن کو اسلام اور کفر کا مقابلہ کہ کر تعارف کراتا تھا۔ ملک محمد دین آرائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور علامہ اقبالؒ مرحوم کا تعلق کشمیری برادری سے تھا ان کو معلوم تھا کہ آرائیں برادری کے ووٹوں کی تعداد اس حلقے میں کشمیری برادری سے کہیں زیادہ ہے۔ اس واسطے میں آرائیں اور کشمیری تفرقے سے بالاتر رہ کر علامہ مغفور کی حمایت میں اپیل کرتا تھا۔ اس عرصے میں متعدد مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کیونکہ ہر رکن ان کے فرمان کے بموجب ہر روز اپنی اپنی کارکردگی پیش کرتا تھا۔ اور یہ روئداد سنتے تھے اور تبادلہ خیالات کرتے تھے ایک دن رات کے دس بجے ان کا نمائندہ خاکسار کے مکان پر تشریف لایا اور حکم دیا کہ آپ کو علامہ صاحب نے صبح یاد فرمایا ہے ان کی قیام گاہ پر پہنچ کر بلوا بھیجنے کی حکمت معلوم ہوئی۔ بڑے مشفقانہ اور ہمدردانہ انداز میں یہ سوال فرمایا کہ آپ نے خلافت کمیٹی کا عہدہ دار ہونے باوجود تحریک ہجرت کی مخالفت کیوں کی؟ میں نے عرض کیا کہ خاکسار اس تحریک کو گاندھی مہاراج کی ایک بدترین چال سمجھتا تھا، کہ جو ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں انہیں تو شدھ کر لیا جائے گا۔ باقی جو ہیں ان کو دیس نکالا دے دیا جائے گا۔ کابل میں جا کر رہیں یا روس میں رہیں یا مکہ مدینہ جا کر رہیں۔ یہاں ان کے رہنے کی گنجائش نہیں۔ ان کو یہ چیز بڑی ناگوار گزری۔ مگر مجمع میں سکون رہا اور میں نے عرض کیا کہ یہ ہجرت پر آمادہ کرنے والے بڑے معزز اراکین خود کیوں ہجرت نہیں فرماتے اور مجمع کو کہا کہ بلا شبہ ہجرت ناقابل برداشت مظالم کے وقت ایک مستحسن فعل ہے مگر اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ غیر مسلم حکومت کے ناقابل برداشت مظالم سے تنگ آ کر دوسرے ملک میں جائیں۔ اس غرض سے جائیں کہ ہم اس ملک میں پناہ گزیں ہو کر قرآن حکیم کی انمٹ ہدایتوں کے مطابق باعزت زندگی گزاریں گے جس کی مثال ہجرت حبشہ ہے۔ حضورؐ نے بھی اس کی اجازت دے دی تھی۔ مگر آپؐ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ جب تک شدید ترین مظالم توڑنے والی حکومت بدل نہ جائے اور منصفانہ حکومت قائم نہ ہو جائے اس وقت تک اس ملک میں واپس نہ آئیں ورنہ یہی ہجرت ان کے لئے بدترین ابدی سزا کا موجب ہوگی۔ چنانچہ جہاں مہاتما گاندھی اور ان کے ہم خیال ہم مسلک ان کے چیلے مسٹر پٹیل اور پنڈت نہرو وغیرہ نے شدھی والوں کو وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو شدھ کرنے کے لئے امداد دی اور ہر صوبے میں، ہر بڑے شہر میں وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ جن میں سے ایک لاہور کا مشہور ترین فساد حویلی کابلی مل متصل ڈبی بازار و چوک سرجن سنگھ بڑے وسیع پیمانے پر ہوا اور سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس فساد میں مسلمانوں نے کافروں کا رویہ اختیار کیا اور کافروں نے مسلمانوں کا یعنی جس پر ہاتھ اٹھاؤ اسے جان سے مار ڈالو۔ (سورۃ نمبر ۴۸ آیت نمبر ۴ پارہ ۲۶ رکوع ۵)۔

اس ناپسندیدہ روش کے نتیجے میں جن ہندو اور

مسلمانوں کے چالان ہوئے۔ مسلمانوں ہی کی عدالتوں نے پھانسی کی سزا دی جن میں چنگڑ محلے کا مقدمہ دنیا میں مشہور ہے۔ انہیں ملک گیر فسادات کے دور میں جو مسلمان ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے۔ انہیں کابل کی سرحد پار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اس پر علامہ اقبالؒ بہت ہنسے اور فرمایا کہ قبوں کے گرانے کے خلاف یہاں جو تحریک چلی تھی اس کی تم نے کیوں مخالفت کی۔ حالانکہ سب مسلمان ماتم منا رہے تھے اور تم اکیلے آدمی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ نجدیوں کے جد اعلےٰ امام عبدالوہاب نجدی توحید کے مسئلے میں بڑے متشدد تھے اور یہاں تک کہ بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا بھی ان کے نزدیک مشرکانہ فعل تھا۔ ممکن ہے کہ اسی تشدد کے ماتحت شریف حسین جیسے لوگوں نے مزاروں اور ان پہ بنے ہوئے قبروں کی زیارت کو جانے والوں کو مشرکانہ حرکات سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ کام کیا۔ کیونکہ نجدیوں سے پہلے حجاز کی امارت کا شرف شریف حسین کو تھا جا کا عرب ممالک میں ترکوں کا اقتدار ختم کرنے میں بڑا دخل تھا اور جو بدترین چال باز انگریز کرنل لارنس سال ہا سال تک اسلام کا مقدس لباس پہن کر ترکوں کے خلاف فضا ساز گار کرتا رہا جسے یہ عرب عقل مندی سے شیخ کویت کے نام پکارتے تھے۔ جب حرمین شریفین میں وہ اسلامی لباس اوڑھ کر اسلامی رسوم کے طور پر نماز ادا کرنے کو آتا تھا۔ تو حرم شریف کی مسجد کے امام صاحبان اس کی اقتدا میں نماز ادا کرتے تھے۔ اور شریف حسین اور اس کے صاحبزادوں پر انگریز کا مطلب برآری کے بعد اعتماد نہ رہا۔ تو نجدیوں کو ان کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی شریف حسین کی کوئی سازش ہو۔ تاکہ ہند کے عوام نجدیوں کے خلاف ہو جائیں۔ اس طرح انگریز کی پھیلائی ہوئی خبروں متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تمام کی تمام صحیح ہوں۔ مگر ان مشکوک خبروں سے متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ تحریک اس وسیع پیمانے پر چل نکلی تھی کہ جگہ جگہ انگریز کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنا پڑی۔ اس لئے نجدیوں کی حمایت میں جو مولانا ظفر علی خان نے جلسہ کرنا چاہا۔ تو وہ جہانگیر کے مقبرے کے صحن میں ہوا۔ خاکسار بھی تماش بین کے رنگ میں اس جلسے کو دیکھنے گیا مولانا ظفر علی خان مرحوم نے مجھے دور سے دیکھا تو سٹیج پر بلا لیا اور تقریر کرنے کی فرمائش کی میں نے وہاں مختصر تقریر کی جو زمیندار اور دوسرے اخباروں کے فائلوں میں محفوظ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

اگر نجدی والئی حرمین شریفین کی حیثیت سے، سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے اور ان مشرکانہ رسوم کو مٹانے کی کوشش کرنے تو سب سے پہلے ان مشرکانہ رسوم میں جو لوگ مبتلا تھے ان کے دلوں میں سے شرک اور کفر کے قبے گراتے تو ان سے مضبوط اور مضبوط تر قبوں کے مٹ جانے کے بعد وہ لوگ پتھروں، اینٹوں کے قبے خود مٹا دیتے۔ نبوت کے اکیس سال کے بعد جب مکہ شریف فتح ہوا تو بعض مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ کعبے کی یہ عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی عمارت کے خلاف ہے۔ خلیل اللہ کی عمارت کو کعبے کی موجودہ عمارت کے جس حصے کو باہر نکال دیا گیا ہے۔ اسے حطیم کہتے ہیں۔ اسے بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی

طرز پر بنا دیں۔ جس طرح آپؐ نے بتوں سے کعبے کو پاک کیا ے ارشاد فرمایا کہ یہ تعمیر اس وقت ہوئی جب میری عمر پینتیس برس تھی اور میں نے خود ایک مزدور کی حیثیت میں اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ مجھے اس کے حصے کے چھٹ جانے کا علم ہے وجہ کا بھی علم ہے۔

چنانچہ حضورؐ کی بات سچی ہوئی تھی۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے حضورؐ کی رد کی ہوئی تجویز کے مطابق کعبے کو تعمیر کیا تا کہ لوگوں میں اسے مقبولیت حاصل ہو۔ انکی فرضی مقبولیت کو حجاج بن یوسف نے خاک میں ملا دیا جہاں اس کی تحریک ختم ہوئی وہاں اس کی بنائی ہوئی کعبے کی عمارت بھی ختم ہوگئی' اور اس نے اس شکل میں اس کی تعمیر کرائی جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے جس کی شکل بدلنے سے پرہیز فرمایا تھا۔ اب تک موجود ہے۔

اس پر خاکسار نے یہ بھی عرض کیا کہ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ خاکسار کو دارالعلوم نعمانیہ ہند کی انتظامیہ کی طرف سے اس تقریر کی تردید کرنے کو کہا گیا خاکسار نے خندہ پیشانی کے ساتھ ان کے نوٹس کی پشت پر لکھ دیا کہ آپ میرا استعفیٰ منظور فرمائیں۔ چنانچہ استعفیٰ منظور ہوگیا۔ اور میں ان طلبہ کو ساتھ لے کر بھاٹی دروازہ کی اونچی مسجد میں آ گیا۔ بھاٹی دروازے کے مخیرّ لوگوں نے ان کے لئے کتابیں مہیا کر دیا اور ان کے قیام اور طعام کا بھی بندوبست کر دیا۔ جنہیں یہاں باقاعدہ درس دیا گیا۔ جو کورس رہ گیا تھا اس کو مکمل کرنے کے لئے یہاں درس دیا گیا۔ علامہؒ نے فرمایا کہ آپ نے اپنے مستقبل کا کیوں خیال نہیں کیا۔ خاکسار نے حضرت علامہؒ کی ہمدردی کے اظہار پر عرض کیا کہ جو مسبب الاسباب مجھے چندروزہ زندگی عطا کرے گا۔ میری ضروریات کا بھی بندوبست فرمائے گا۔ ان الفاظ پر یہ پانچویں ملاقات ختم ہوئی۔

(۲) جب گاندھی جی سمیت ہندو اکابر کی فریب کاریوں سے ہندو مسلم اتحاد کا تاج محل زمین بوس ہوگیا۔ اب وہی بزرگ اسی فریب کاری کے محل کا میٹیریل جو تھا۔ شدھی اور سنگھٹن کے تخریب کارانہ اوزار سے ریزہ ریزہ کر رہے تھے اور ملک گیر فسادات کا سلسلہ جاری تھا۔ اس فتنہ پردازی کو مزید فروغ دینے کے لئے ایک طرف ہندو پریس اس ریزہ ریزہ شدہ میٹیریل سے اپنی زمین کو پاک کرنے کے لئے آمادہ کرتا رہتا تھا۔ وہ لگاتار ایڈیٹوریل مسلمانوں کے خلاف لکھتے تھے یہ جو مکے سے آئے ہیں وہ مکے جائیں ان کا ہندوستان میں کیا کام ہے۔ مسلمانوں کا نام انہوں نے ملیچھ قوم رکھا ہوا تھا اور شودروں سے بھی ان کو حقیر تر سمجھتے تھے اور اسی پریس میں ان کے لیڈروں کے زہریلے بیانات اسی قسم کے شائع ہوتے تھے۔ دوسری طرف فتنہ انگیز اشتہاروں' پمفلٹوں اور رسالوں کی شکل میں بے پناہ زور سے پروپیگنڈہ کرنا شروع کیا۔ جن میں سے جن میں سے رنگیلا رسول اور ورتمان وغیرہ کی دل آزارانہ روش کی بدولت انگریز کو ان کی ضبطی کے احکام بھی با دل نخواستہ جاری کرنے پڑے اور پورے پنجاب میں خصوصاً ہندوؤں کے خلاف ایجی ٹیشن غیر منظّم طریق پر شروع ہوگیا۔ جس میں مجلس احرار اسلام پیش پیش تھی علامہ اقبال پنجاب کونسل کے ممبر بھی ہو چکے تھے۔ وہ تو کونسل کی ممبری

سے قبل بھی ہزار عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور بڑے بڑے سرکردہ مسلمان ان کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کی اس دل آزارانہ کتاب رنگیلا رسول اور اس کے خلاف کی گئی غیر منظم ایجی ٹیشن کو کنٹرول کرنے کے لئے معززین کی ایک جماعت کو بلایا۔ جن میں بڑے بڑے سرکردہ خطابات یافتہ وکلاء اور جج صاحبان کے علاوہ علمائے کرام بھی تھے۔ خاکسار کو بھی اس محفل میں شرکت کے لئے بلایا۔ محفل میں حضورؐ کی عزت واحترام کو قائم رکھنے کے لئے اور آپؐ کی عزت و ناموس پر حملہ کرنے والوں کے خلاف استغاثہ دائر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ خاکسار نے پوری خاموشی کے ساتھ ان کے اس فیصلے کو سنا مگر آپؒ نے اپنی خاص کرم نوازی سے خاکسار کو کہا کہ بدو صاحب آپ کیوں نہیں بولتے۔ خاکسار نے عرض کیا کہ مجلس مشاورت کے معززین کے احترام کا تقاضا ہے کہ میں کچھ نہ بولوں۔ مگر آپؒ نے اصرار فرمایا کہ آپ کو بولنا پڑے گا۔ خاکسار نے ان کی اور ان کی بلائی ہوئی محفل کا احترام کرتے ہوئے عرض کیا کہ کیا ان بزرگوں اور علمائے کرام نے اس ملعون کتاب کا پوری طرح سے مطالعہ فرما لیا ہے؟ ہندوؤں کی ملعون جماعت کے ملعون نمائندے نے اس کتاب میں بھی بڑی فریب کاری کی ہے۔ کیونکہ اس اس کتاب میں تمام حوالہ جات مسلمانوں کی کتابوں سے دیئے ہیں اور استغاثہ میں آپ بزرگوں کی طرح باقی تین جماعتوں کو جو قانونی طور پر مسلمان کہلاتی ہیں ان کے نمائندوں کے دستخط بھی ہونا چاہئیں۔ ورنہ وہ سرمایہ دار ہندو قوم ان جماعتوں کے مسلمانوں کو صفائی کے طور پر شہادت پیش نہ کردیں۔ اس پر علمائے کرام کچھ ناراض ہوئے کہ ہم تو ان مسلمانوں کا فر سمجھتے ہیں خاکسار نے عرض کیا کہ وہ بھی آپ کو کافر سمجھتے ہیں اور یہاں جو اہل حدیث، دیو بندیوں، بریلویوں اور شیعوں کی طرف سے نمائندہ کے طور پر موجود ہیں۔ ان کے خود ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے موجود ہیں۔ آپؒ نے مجھے حکم دیا کہ ابھی استغاثہ ان بزرگوں کے مشورے سے تیار ہوتا ہے جس پر ان کے دستخط ہوں گے آپ ان جماعتوں کے نمائندوں کے دستخط خود کرائیں۔ خاکسار نے ہامی بھر لی، چنانچہ خاکسار نے اس تیار شدہ استغاثے پر لاہوری جماعت کے امیر مولانا محمد علی اور قادیانی جماعت کے مرزا بشیر الدین اور چکڑالوی جماعت کے مولانا چشمت علی سے بڑی آسانی سے دستخط کروائے۔ اس طرح استغاثہ مکمل ہو کر اس دور کے مروجہ طریق کار کے مطابق مسٹر فیل بوتھ (اینگلو انڈین) مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ دائر ہونے کے بعد اس استغاثے کے بارے میں کئی دفعہ شرف باریابی حاصل ہوا۔ اور وہ حضور اکرمؐ کی محبت میں پوری طرح مست ہو کر زار و قطار روتے تھے۔ میں نے عرض کیا ''آپ غیر معصوم بزرگوں کی تحریروں سے متاثر ہو کر کب تک آنسو بہاتے رہیں گے۔ یہ تو آوے کا آوا ہی خراب ہے۔ آپ کا فرض تھا جو اس ملعون مصنف کے خلاف استغاثہ دائر کر دیا اب فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے اور معجزنمائی کرنا خدا کا کام ہے''۔ استغاثے کی طرف سے شیخ محمد نصیب ایڈووکیٹ کو منتخب کیا گیا۔ آپؒ کے حکم اور اصرار پر خاکسار نے عرض کیا کہ وکیل صاحب کا دل بھی حضورؐ کی عزت واحترام سے بھرا ہوا ہے۔ ملعون

راجپال نے اپنی صفائی کا بیان دیتے ہوئے یہ کہا کہ میں نے اس کتاب میں تو اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ مسلمانوں کی مستند کتابوں کے حوالے دیئے ہیں اور صفائی کے گواہوں کی فہرست پیش کی جن میں سب سے زیادہ معزز گواہ اس نے پنڈت رام چندر دہلوی کو بنایا اس کے لاہور اسٹیشن پہنچنے پر ہندو زعما نے اس کا بڑی عزت سے استقبال کیا دوسرے دن اس کی شہادت ہونی تھی۔ شیخ محمد نصیب صاحب گورداسپوی نے علامہ رحمتہ اللہ کے حکم کے مطابق رات کا بیشتر حصہ اس مقدمے کی روئیداد کے بڑے بڑے حصوں کو میرے سامنے پیش کرنے میں گزارا اور صفائی کے گواہوں پر جرح کرنے کے وجوہ دریافت کئے خاکسار نے ان سے عرض کیا کہ آپ حضورؐ کے عشق میں مست ہو کر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کے اس عشق و محبت کو قائم رکھے لیکن جرح کے وجوہ تو صفائی کی شہادتوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ آپ پہلے ہی کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ چنانچہ دوسرے دن شیخ محمد نصیب صاحب کے ساتھ خاکسار بھی اجازت لے کر عدالت میں پیش ہوا۔ عدالت نے اپنی روٹین کے مطابق کارروائی شروع کی۔ پنڈت رام چندر نے شہادت شروع کرنے سے قبل اپنے تعارف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے خاکسار نے ان کو چٹ پر لکھ کر یہ سوال دیا کہ آپ بتائیں کہ تمام مسلمان فرقوں کی مستند مسلم کتاب کون سی ہے۔ اس پر خدا کی طرف سے اس زبان سے عدالت کے سامنے یہ لفظ نکلوا دیا کہ تمام فرقوں کی مستند کتاب قرآن ہے اور عدالت نے یہ الفاظ ریکارڈ کر لئے ضمنی سوالات شیخ محمد نصیب صاحب کی طرف سے میں نے چٹ لکھ کر یہ کروائے کہ مسلمانوں کی مستند کتابیں تو بہت سی ہیں جن میں سے بعض کے حوالے رنگیلا رسول میں موجود ہیں۔ لیکن دوسرے فرقے انہیں مستند نہیں مانتے تمام فرقوں کی مستند کتاب صرف قرآن ہے عدالت نے یہ جواب بھی ریکارڈ کر لیا۔ تیسرا یہ سوال چٹ پر لکھ کر ان کے حوالے کیا کہ یہ رنگیلا رسول اور یہ قرآن پاک ہے۔ آپ ثابت کریں کہ اس مستند کتاب میں یہ لغو اور لچر باتیں موجود ہیں۔ پھر بھی اس کی زبان سے خدا نے نکلوا دیا کہ اس کی پہلی سطر سے آخری سطر تک کسی آیت میں ان الزامات میں سے کسی ایک الزام کا بھی ذکر نہیں۔ خدا کی اس معجز نمائی کے نتیجے میں عدالت نے راج پال کو مجرم قرار دیا اور چھ ماہ کی سزا دی یہ تھا ایک ملاقات کا پس منظر۔

دوسرے دن جہاں ہندو اخباروں نے اس فیصلے کو شائع کیا۔ وہاں خاکسار کے خلاف جو کچھ وہ لکھ سکتے تھے انہوں نے لکھا وہاں مسلمانوں میں سے محترم سید حبیب صاحب نے اپنے اخبار سیاست میں بھی مجھ پر اپنی کرم نوازی کے پھول برسانے میں کمی نہ کی اور خاکسار کو چکڑالوی کے لقب سے نوازا۔ چنانچہ یہ زریں اخبار علامہؒ کے مطالعہ میں آیا۔ تو آپ نے اپنے معزز نمائندے کے ذریعے مجھے کہلا بھیجا اور اس فیصلے پر ان کو بے پناہ مسرت حاصل ہوئی تھی۔ سید صاحب کی گل فشانی اور ذرہ نوازی پر فرمایا کہ ہمیشہ سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ حق گوئی کے بدلے میں بیگانوں نے بڑھ کر اپنے لعنت کے تیر برساتے ہیں۔ دستور کے مطابق ان فریب کار سرمایہ دار ہندوؤں کے ایجنٹ کی طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی اور غیر مسلم بنچ نے راج

پال کو بری کر دیا۔ اس کے بری ہونے پر پھر ایجی ٹیشن شروع ہوگیا۔ اس دوران میں ایک غریب طبقے کے مسلمان نے حضورؐ کی عزت واحترام سے بھرپور ہو کر ملعون راج پال کو دن دہاڑے اس کی دکان پر قتل کر دیا۔ اس نوجوان کا نام علم الدین تھا۔ چالان ہوا مگر وہ عاشق رسولؐ ابتدائی عدالت سے لے کر عدالت عالیہ تک راج پال کے قتل کے الزام کو صحیح تسلیم کرتا رہا۔ نہ اپنے بے سہارا رشتہ داروں کی بے چارگی سے متاثر ہوا اور نہ اکابر سے اکابر سے اکابر ترین وزرا کے مشوروں کی پروا کی۔ بالآخر ۱۹۲۹ء میں میانوالی جیل میں پھانسی کی شکل میں سزا پائی مسلمانوں کا اصرار تھا کہ اس کی لاش کو لاہور لایا جائے۔ مگر پنجاب کی سرکار کو نقض امن کا شدید ترین خطرہ تھا مگر سر میاں شفیع مرحوم نے اپنی ذاتی ضمانت کی بنا پر گورنر کے دل میں جو خطرہ تھا اسے دور کر دیا اور وہ اپنی اس ذاتی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ شہید علم الدین کی میت پوری شان وشوکت اور عزت واحترام اور پورے امن وامان کے ساتھ قبرستان میانی میں دفن کر دی جو اب تک زیارت گاہ خواص وعوام ہے۔

(۷) علم الدین شہید کی تدفین کے بعد علامہ اقبالؒ نے اپنے تاریخی خطبات کی ترتیب وتدوین کے سلسلے میں کئی بار خاکسار کو نہ صرف اپنی ملاقات کا شرف بخشا بلکہ ان کے بعض حصے منانے سے بھی عزت افزائی فرمائی اور حضرت امام اعظمؒ کے طریق استحسان کی کچھ تفصیلات' ماہیت' کیفیت' کمیت اور حالات کا جو ہمیشہ بدلتے رہتے۔ کوئی متعین ضابطہ نہیں مقرر فرمایا مثال کے طور پر آپ (سورۃ نمبر۴۲ کی آیت نمبر۴۰) ملاحظہ فرمائیں اور اس کے ساتھ مجلس شوریٰ کو ہر دور میں بدلے ہوئے حالات کے ماتحت قائم رکھنے کا حکم دیا (سورۃ نمبر۴۲ آیت نمبر۳۸ پارہ ۲۵ رکوع ۵ اور سورۃ نمبر۳ کی آیت نمبر۱۵۸ پارہ ۴ رکوع ۸) میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان میں بے حد دیانت دار اور قرآن شناس مجلس شوریٰ سے مشورہ لینے کا حکم دیا اور جنگ بدر سے لے کر حجتہ الوداع تک اس معزز مجلس شوریٰ سے مشورہ لیتے رہے اور ان کی بار بار شاباش لینے سے خاکسار کو اپنی تعلیم کو اور زیادہ مکمل کرنے کا موقع ملا۔ ان ملاقاتوں کے علاوہ اہم ترین ملاقات وہ ہے۔ جو اشاعت اسلام کالج کے نام سے انجمن جماعت اسلام کی تاریخ میں موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ وائسرائے کی کونسل کے معزز ممبر سید غلام بھیک نیرنگ نے شدھی ار سنگھٹن کی تحریک کو بے اثر بنانے کے لئے تبلیغ کی ایک انجمن انبالہ میں قائم کی اور علامہ کے سامنے عرض کیا کہ ان قدیم درس گاہوں کے سند یافتہ لوگ اس مردود تحریک یعنی شدھی کو ختم نہیں کر سکتے۔ اس تحریک کے ہشیار پنڈتوں نے رنگیلا رسول ایسی ملعون کتابیں جو لکھی تھیں اور یورپ کے مستشرقین نے جو دل آزار کتابیں لکھی تھیں ان سے کام لے کر ان کی پیش کی گئی ہوئی حدیثوں کو پیش کرتے ہیں اور ہمارے بزرگ انہیں تسلیم کر کے قسم قسم کی تاویلیں کرتے ہیں۔ جو الٹا عام مسلمانوں کے شکوک میں اضافے کا موجب ہوتی ہیں۔ ان کی انجمن کے دل خراش نتائج سن کر ان سے اشاعت اسلام کالج قائم کرنے کا وعدہ فرمایا اور انجمن حمایت اسلام کے معزز اراکین کو اس پر آمادہ کیا اور خاکسار کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ جن آیتوں کی آڑ میں ہمارے مفسرین نے

احادیث جمع کی ہیں۔ جن کی آڑ لے کر غیر مسلم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اور ان کے قرآن سے لوگوں کو متنفر کرتے ہیں۔ تمہارا یہ فرض ہے کہ اشاعت اسلام کالج کے ایک اعزازی وائس پرنسپل کی حیثیت سے اپنا درس انہیں آیتوں میں محدود کرو اور ان احادیث کے متعلق طلبہ کو صحیح اور تسلی بخش جواب دینے کی تربیت دو۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں وہ کالج قائم ہوگیا۔ جو قرار داد پاکستان کے بعد تقریباً ۱۹۴۴ء تک جاری رہا ۴۴۔۱۹۴۳ء میں اس کالج کو انجمن نے بند کر دیا۔ اس کالج میں بڑے اچھے ذہین طلبہ داخل ہوئے جو جدید تعلیم کی رو سے کم از کم فرسٹ ڈویژن میٹرک پاس ہوتے تھے۔ ان کو داخلہ دیا جاتا تھا۔ ان میں سے مرزا عبدالحمید مرحوم جو پاکستان بننے کے بعد اوکاڑہ کالج کے پرنسپل ہوئے اور صدر ایوب خان کے دور میں ان کے مذہبی مشیر رہے دوسرے مولانا عبدالستار نیازی جو اب تک اللہ کے فضل و کرم سے موجود ہیں۔ اسی طرح دوسرے بزرگ بھی تھے۔ اس کالج کے اس وقت پرنسپل حضرت یوسف سلیم چشتی تھے۔ جنہیں نے بعد میں مولوی فاضل کی سند پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی یہ بھی خدا کے فضل و کرم سے اب تک زندہ ہیں اس سلسلے میں میں نے اس سات سال میں نہ صرف غیر مسلموں کا لٹریچر بلکہ اپنے بڑے بڑے مفسرین کرام کی اردو، فارسی اور عربی میں تفسیریں بھی دیکھیں اور مشہور مناظر مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم اور مرزا غلام احمد قادیانی کا وہ لٹریچر بھی پورے غور کے ساتھ دیکھا جو انہوں نے گستاخ پادریوں اور پنڈتوں کے جواب میں لکھا تھا۔ خاکسار نے ان تمام آیات کا جو خاکسار کی نظر میں صحیح ترجمہ تھا وہ بیان کر دیا اور قابل صد احترام مفسرین نے ان کے متعلق جو گل فشانیاں فرمائی تھیں ان کے وہ پھول ان کی قبروں میں دفنا دیئے اور یہی کہا کہ خدا تمہاری مغفرت کرے۔ نمونے طور پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے سیرت نگاروں نے جو ہولناک واقعہ درج فرمایا ہے۔ اور جسکی آڑ لے کر غیر مسلموں نے جو بکواس کرنی تھی وہ سب کی۔ اس واقعہ کا نام ''امک'' ہے ہمارے بزرگوں نے (سورۃ نمبر۲۴ آیت نمبر۱۱ تا۲۶) ان سولہ آیات کے ذیل میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ درج فرمایا ہے۔ لیکن میں نے ان بزرگوں کو خود یہ ہولناک واقعہ بیان کرتے ہوئے دیکھا کہ زار و قطار رو رہے تھے۔ خاکسار نے اشاعت اسلام کالج کے سامنے اور پھر علامہ اقبالؒ کے رو برو ان سولہ آیتوں کو پیش کیا اور عرض کیا کہ ان میں سے کون سی آیت ہے جس کا اس واقعہ حائلہ سے ہے۔ ان آیتوں میں نہ اس جنگ کا ذکر ہے۔ جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ اس جنگ میں پیش آیا اور حضرت عائشہ صدیقہؓ تو کجا امہات المومنین میں سے کسی کا ذکر تک نہیں، ہاں؛ گیارھویں آیت میں لفظ ''امک'' کا ذکر ہے لیکن امک کا لفظ کوئی اسی آیت سے مخصوص نہیں ہے اور بھی کئی جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ نے جو اپنی ستارہ پرست قوم کے ساتھ مذاکرہ کیا اس مذاکرے میں بھی اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ جو کہ ان جھوٹے معبودوں اور من گھڑت فرضی داستانوں کی وجہ سے پوجے جاتے تھے۔ انہیں بھی' امک' کہا ہے۔) سورۃ نمبر۳۷ آیت نمبر ۸۶ پارہ ۲۳ رکوع ۷) اسی لفظ کے متعلقات' افاک' من گھڑت جھوٹی خبریں گھڑنے

والے کو کہا ہے اور وہ بستیاں جو ایک نا قابل ذکر بے حیائی اور بدکاری کی من گھڑت خبروں کی وجہ سے الٹا دی گئی تھیں۔ ان کو موتفکات' کہا گیا ہے۔ (سورۃ نمبر ۹ آیت نمبر ۶۰ پارہ ۱۰ رکوع ۱۵) اسی لفظ کا مضارع اور ماضی مجہول کی شکل میں قرآن میں استعمال ہوا ہے گو ان لوگوں کو کہا گیا ہے۔ جو اپنے من گھڑت عقائد کی وجہ سے قرآنی ہدایات سے منحرف ہو کر ان ہدایات کو پیش کرنے والوں کیلئے ہے۔ یہ لفظ کوئی زنا کی تہمت کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ (سورۃ نمبر ۵۱ آیت نمبر ۹ پارہ ۲۶ رکوع ۱۸) اور اسی (سورۃ نمبر ۳۴ آیت نمبر ۲۲ پارہ ۱۸ رکوع ۸) میں یہ اعلان فرمایا کہ اس قسم کے لغو لچر اور بے ہودہ باتیں سنتے ہی کہہ دینا یہ من گھڑت جھوٹ ہے اور سورۃ نمبر ۱۳ میں اعلان فرمایا کہ اس قسم کی غلط بیانیوں اور من گھڑت باتوں کے ثبوت میں جب تک وہ مکار فریب کار لوگ عدالت میں حاضر ہو کر شہادت نہ پیش کرسکیں تو انہیں بہتان تراشی کی سزا ملنی چاہیے۔ ورنہ وہ خدا کے قانون کی نظر میں جھوٹے ہیں۔ اسی کا تذکرہ اسی سورۃ کے ساتویں رکوع کی آیت ۴ میں اس کو سنگین جرم قرار دیا۔ اور (۸۰) اسی کوڑوں کی سزا مقرر کی اور یہ بھی اعلان فرمادیا کہ ایسے لوگوں کی کسی دوسرے مقدمے میں بھی شہادت قبول نہ کی جائے اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۱۶ میں اعلان فرمایا کہ جس خبر کی معصوم نبی' معصوم قرآن اور معصوم قرآن بھیجنے والے خدا پر زد پڑتی ہو۔ اور ان کی عصمت کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہوں' مسلمانوں کو حکم دیا کہ تمہیں ایسی لچر خبر سنتے ہی بغیر کسی تفتیش کے یہ کہہ دینا چاہیے۔ ''ہذا بہتان عظیم''، اور تمہیں اسے آگے نہیں پھیلانا چاہیے' لہذا' افک کے مسئلے کی بنیاد ہی غلط ہے نہ لغت اس کی تائید کرتی ہے نہ قرآن۔

نمونے کے طور پر ایک حدیث حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' قرآن کی آخری دو سورتوں کو مفسرین کرام نے عموماً صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث کی آڑ لے کر یہ ارشاد فرمایا کہ آپؐ پر ایک یہودی نے بہت بڑا جادو کیا۔ جس سے آپ مسحور ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپ خاکم بدہن اس جادو سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ خیال کرنے تھے کہ آپ نے ایک کام کیا ہے حالانکہ وہ کام آپ نے نہیں کیا ہوتا تھا یا خاکم بدہن آپ جادو زدہ ہو کر اس یہودی کے جادو سے متاثر ہو کر یہ خیال فرماتے تھے کہ آپؐ نے فلاں کام نہیں کیا حالانکہ وہ کام آپ نے سیکڑوں آدمیوں کے سامنے کیا ہوا ہوتا تھا اور اسی کارکردگی سے غلامان محمدؐ کے دلوں میں آپ کی بے پناہ الفت پیدا کرنے کے لئے ان دونوں سورتوں کو جو حقیقت میں مکی ہیں مدنی بنا کر پیش کیا۔ حالانکہ قرآن پاک نے آپؐ کے بدترین دشمنوں کے لگائے ہوئے الزاموں کی تردید کی۔ اسی طرح یہ تردید بھی فرمائی آپؐ نہ ساحر تھے نہ مسحور۔ ان کی ان الزام تراشیوں سے قرآن بھرا پڑا ہے (سورۃ نمبر ۲۵ آیت ۸ پارہ ۱۸ رکوع ۱۶ وسورۃ نمبر ۱۷ آیت نمبر ۴۶ پارہ ۱۵ رکوع ۵)

قرآن حکیم میں اس قسم کی جتنی آیات ہیں جن کی علامہ اقبالؒ نے نشان دہی کی یا طلبہ نے مفسرین کی تفسیریں پڑھ کر اپنے شکوک کا اظہار فرمایا اور خاکسار نے ان تمام شکوک کا ازالہ کیا' علامہ اقبالؒ اس سے بے حد خوش ہوئے اس سلسلے میں

ہمیشہ طلبہ اور پرنسپل صاحب بڑی عقیدت مندی سے ان سے ہر روز ملتے تھے اور آپ کی محفل میں اسی موضوع پر بحثیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ (سورۃ نمبر ۸۰ آیت نمبر ۱ تا ۱۲) قرآن کریم کو منگوا کر اور سامنے رکھ کر ان کا ترجمہ فرما کر حکم دیا کہ ان کے مشہور ترجموں اور تفسیروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم روسائے قریش کو پیغام خداوندی پہنچا رہے تھے۔ تو اتنے میں ابن ام مکتوم آ گئے اور انہوں نے آپ کی توجہ کو اپنی طرف پھیرنا چاہا جسے حضور صلوۃ اللہ علیہ السلام نے ناپسند کیا۔ خاکم بدہن خدا تعالیٰ نے اس ناپسندیدگی پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ خاکسار نے عرض کیا۔ اس سورۃ کی آیتوں میں سے چند آیتوں میں ضمیر غائب کا مرجع مفسرین نے حضورؐ کی ذات گرامی کو بنا دیا اور پھر جو ان میں خطابات کے صیغے ہیں۔ ان کا مخاطب حضورؐ بنا دیا تو قصہ بن گیا۔ خاکسار نے عرض کیا کہ آپ بتائیں کہ اس سورۃ کی کسی آیت میں حضور کے نام یا لقب کا تذکرہ ہے۔ فرمایا کہ نہیں تو خاکسار نے عرض کی کیا کہ پھر حضورؐ کو اس کا مصداق کس دلیل پر ٹھہرایا گیا برا منایا منہ پھیر لیا۔ آخر کس سے؟ دراصل ان غائب ضمیروں کا مرجع (سورۃ نمبر ۶۹ آیت نمبر ۳۸۔۳۷۔۴۳ و ۴۶) دین فروش اور زر پرست انسانوں کا تذکرہ ہے اور یہ غائب ضمیریں انہیں شخصوں کی طرف جاتی ہیں ایسے لوگ بے کس مزدوروں جو حق کی تلاش میں ان کے پاس آتے ہیں۔ ان کا آنا ان کو یعنی روسا کو ناگوار گزرتا تھا اور مخاطب بھی وہی ہیں اور ان میں عبوس تولی تصدی اور تلہی کے جو افعال آئے ہیں۔ حضورؐ تو نسل انسانی کو ان قبیح افعال سے روکتے ہیں اور خاکم بدہن یہی افعال آپؐ میں موجود تھے، عبوس کے معنی ہیں ترشروئی، سختی سے پیش آنا، تولی کے معنی روگردانی، منہ موڑنا، تصدی، لایعنی بات کرنا اور تلہی کسی کا مذاق اڑانا، فعل کو دیکھ کر فاعل متعین کیا جاتا ہے۔ یہ افعال تو حضورؐ کے دشمنوں اور کافروں کے تھے۔ جنہیں حضورؐ روکنے کیلئے آئے تھے۔ چنانچہ بدترین کافروں کے اوصاف یہ بیان کئے ہیں کہ وہ قرآن کریم کو سن کر شیوریاں چڑھاتے ہیں اور پھر پیٹھ پھیر جاتے ہیں۔ اور اپنے تکبر میں مست ہو کر حق پرستوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں (سورۃ نمبر ۷۴ آیت نمبر ۲۳۔۲۲ پارہ ۲۹ رکوع ۱۵) خاکسار نے عرض کیا اس کی تفسیر ہمارے ایک پنجابی شاعر نے کی ہے۔

جتھے ویکھن چنگا چوکھا پڑھن کلام سوائی ہو
جتھے ویکھن دال تے روٹی حرف نہ آوے کائی ہو

☆☆☆

دوئیں جہاناں مٹھے باہو جنہاں ویچ کھادی کمائی ہو

خاکسار نے گزارش کی کہ انہیں گیارہ آیتوں کے بعد بارھویں آیت میں فرمایا کہ تمہیں ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہیے یہ میری انمٹ ہدایتیں اور ناقابل تردید صداقتیں نسل انسانی کے لئے بڑی عظیم الشان نصیحتیں ہیں، غریب امیر جو نصیحت حاصل کرنا چاہیں انہیں یکساں مواقع حاصل ہیں۔ پھر ہمارے بزرگوں نے حضرت ابن ام مکتوم کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے ان کے نابینا ہونے کا عذر پیش کیا۔ میں نے عرض کیا۔ کہ حضورؐ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ گفتگو سننے کا تعلق آنکھوں سے نہیں۔ ان بزرگوں کو چاہیے کہ ان کے نابینا ہونے پر زور نہ دیتے بلکہ ان کے بہرہ

ہونے پر زور دیتے۔ اس گفتگو کے بعد یہ مجلس برخاست ہوئی۔

(۸) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے مثل عصمت کے متعلق ڈاکٹر اقبالؒ کو معلومات بہت تھی۔ لیکن جب سید غلام بھیک نیرنگ مرحوم و مغفور انبالوی نے ہندوؤں کی جارحانہ تحریک شدھی کو خطرناک فتنہ ارتداد کی بدترین شکل میں دیکھا اور ہمہ تن اس کا مقابلہ کرنے کیلئے دعوت التبلیغ کے نام سے انبالہ میں میں انجمن قائم کی۔ اور چند مہینے پرخلوص کام کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوؤں کی جارحانہ شدھی کی بنیاد مفسرین' محدثین اور مورخین کو وہ غلط روایات ہیں جو قرآن کریم میں پیش کی ہوئی انمٹ صداقتوں اور ناقابل تردید حقائق سے تغافل برتتے ہوئے نہ صرف اپنی مصنفہ کتابوں میں درج کرلیں۔ بلکہ انہیں قرآن کی شکل میں پیش کیا اور نیرنگ صاحب کی مخلصانہ مساعی کو تقویت دینے کیلئے انجمن حمایت اسلام لاہور کی جنرل کونسل کو اشاعت اسلام کالج کے نام پر ایک کالج قائم کرنے پر آمادہ کرلیا اس کالج کا اہم ترین موضوع یہی تھا کہ قرآن پاک کی جن آیتوں کے ذیل میں اس قسم کی روایتیں درج کی گئی ہیں ان کا قلع قمع کیا جائے۔ اس لئے کہ صحابہ کرام کے سمیت نہ تو وہ مصنفین کرام معصوم ہیں اور نہ حدیثوں کی روایت کرنے والے معصوم ہیں۔ بڑے سے بڑے راوی کی حیثیت محض ایک غیر معصوم شہادت کی ہے۔ اور ان غیر معصوم راویوں کی شہادت پر جن بزرگ مصنفین نے فیصلے فرمائے ہیں وہ بھی غیر معصوم ہیں۔ لہذا حضور اکرمؐ کی ناقابل تردید عصمت کا فیصلہ کیا ہے اور اسی قطعی عصمت کو ان کی نبوت اور رسالت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ چند مثالیں انسان کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔

سورۃ نمبر ۹۶ کی پہلی تین آیتوں کو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلے قرآن میں نازل ہوئیں۔ لیکن ہمارے بڑے جلیل القدر بزرگوں نے ایک ایسی روایت کو اس کی تفسیر میں درج کردیا کہ غار ثور میں جب جبرئیلؑ خدا کی طرف سے یہ پانچ آیتیں لے کر نازل ہوئے تو آپؐ کی حالت معاذ اللہ اتنی غیر ہوئی کہ ہزاروں مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے گھر پہنچے اور گھر والوں کو حکم دیا کہ مجھ پر لحاف ڈالو۔ میری حالت غیر ہوگئی۔ چنانچہ اس تبدیلی حالات کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس زمانے کے ایک علم دوست ورقہ بن نوفل نے آپؐ کی تشخیص کے بعد آپؐ کو اطمینان دلایا کہ آپ بیمار نہیں ہیں۔ آپ کو خدا نے اپنے کلام سے نوازا ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ کہ ۹۶ (چھیانوے) نمبر سورۃ ان پانچ پہلی آیتوں میں کسی ہولناک خبر کا وجود نہیں۔

سورۃ نمبر ۹۳ (ترانوے) میں کی ایک آیت نمبر سات اور آٹھ پہلے تو ہمارے بزرگوں نے یہ ترجمہ فرمایا اور حضورؐ کی عزت و احترام کا شرف حاصل کیا اور مسلمانوں کو خدا کی کرم نوازی سے آگاہ فرمایا۔ لیکن تیسری آیت کا ترجمہ یوں فرمایا کہ تو گمراہ تھا۔ تجھے سیدھی راہ پر میں نے لگایا اور تم تنگ دست تھے خدا نے تمہیں مالدار بنا دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ لفظ ''ضال'' کو عربی زبان میں اور قرآن کریم میں کئی معنوں میں استعمال کیا۔ کسی چیز کی محبت میں زیادہ منہمک ہونے کو بھی ''ضال'' کہتے ہیں اور کسی ضروری چیز سے بے خبر ہونے والے کو بھی ''ضال'' کہتے ہیں۔ اسی ۹۳ نمبر کی سورت کی تیسری آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میری مدد سے تم کبھی محروم نہیں ہوگے اور نہ کبھی ناراض ہوگے۔ یہاں ایک سیدھی سادی چیز کو ایک کہانی کی شکل میں بیان فرمایا کہ حضورؐ دو تین رات بیمار ہوگئے۔اور تہجد کیلئے مسجد حرام میں نہ جاسکے۔ایک خبیث عورت نے کہا۔(معاذ اللہ) جسے تم خدا کہتے ہو اس شیطان نے تمہاری حمایت چھوڑ دی ہے۔حالانکہ تہجد کے لئے جاگنا' مسجد حرام میں نہ جانا' اور خدا کی ناراضگی میں کوئی تلازم نہیں ہے۔نہ قرآن کے نزول کے متعلق وہ یہ بکواس کرسکتی ہے۔کیونکہ قرآن تو وقفوں کے بعد اترا ہے۔(سورۃ نمبر ۲۵' آیت نمبر ۳۲ پارہ ۱۹ رکوع پہلا)۔

علامہ اقبالؒ اشاعت اسلام کالج کے نصاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے پر بار بار اصرار فرماتے تھے نیرنگ صاحب کی رپورٹ سے قبل مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابیں ازبر کئے ہوئے تھے۔سید صاحب کی ناکامی نے جلتی پر تیل ڈال دیا خاکسار یہ معذرت کرتا ہوا کہ ان کے اعتراضات کے جوابات کا سلسلہ خود مسلمانوں کی مستند کتابوں سے حرف گیری کے بغیر نجات مشکل ہے۔اور جن کتابوں کی عدم موجودگی میں نہ صرف عربوں نے خدا کی انمٹ حقیقتوں کو رسول اکرمؐ کی پہلی چالیس سالہ زندگی کے آئینے میں دیکھ کر سمجھ لیا تھا اور عربوں کے سوا جو لوگ حق کے متلاشی تھے۔انہوں نے بھی ان ناقابل تردید صداقتوں پر یقین کامل حاصل کرلیا تھا اور جس انمٹ مکمل مفصل کتاب کو دنیا کے سامنے پیش کیا اسے خود قرآن کریم نے بار بار ''الکتاب المبین'' کہا ہے اور اسی قرآن حکیم کا انمٹ ہدایتوں اور ناقابل تردید صداقتوں کو تبیان لکل شئی کا لقب عطا فرمایا ہے۔آخر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے وصال کے بعد کونسی ناقابل حل مشکلات (خاکم بدہن) پیدا ہوگئیں۔جن کے سمجھنے کے لئے حضرت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری مرتب کرنے سے پہلے خود چھ لاکھ حدیثوں کا ذخیرہ جمع کرلیا۔جن میں سے ان کے اعتقاد کے مطابق روایتاً' قانوناً و درایت کی رو سے صحیح ترین روایتیں تکرار احادیث کو نظر انداز کرنے کے بعد تقریباً پانچ ہزار بمشکل بنتی ہیں۔اسی قانون درایت کی اتباع کرتے ہوئے آپ کی زندگی ہی میں ان کی تعداد بڑھ گئی اور جو روایات کی تنقید کی بنیاد آپ نے رکھی تھی۔اسے بالکل نظر انداز کردیا گیا اور خوابوں اور کشفوں کے نام ان کی منتخب احادیث پر اپنی عقیدت مندی کی بناء پر کل روایات کی تنقید سے اجتناب کیا۔جو صریحاً قرآن کریم کی انمٹ ہدایتوں کی روشنی میں عام انسان کے خلاف نظر آتی ہیں اور مفسرین کرام نے محض عقیدت مندی کی بنا پر انہیں قرآن کریم کی تفسیر قرار دیا۔ان عظیم ترین بزرگوں نے خود جن احادیث کو صحیح مانتے ہوئے ظنی قرار دیا تھا۔الٹا حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت نے جس قانون درایت کی رو سے ان اقوال وافعال کو محدثین نے حضور کی طرف یا صحابہ کرام کی طرف منسوب کئے یا نیکوکار تابعین کی طرف منسوب کئے تھے۔کے پرکھنے کا معیار قرآن کریم کو قرار دیا تھا اور یہ اعلان فرمادیا تھا کہ گو ویسی بے ضرر احادیث جو حضورؐ کی طرف نسبت کی وجہ سے احادیث مرفوعہ اور صحابہ کرامؓ کی طرف نسبت کی رو سے جن کو احادیث موقوفہ اور نیکوکار تابعین کی طرف منسوب کردہ کی وجہ سے احادیث مقطوعہ کہا جاسکتا ہے اور ان کی صحت تسلیم کی جاسکتی ہے لیکن ان میں سے

کوئی قرآن کی طرح یقینی نہیں ہے۔ الٹا امام اعظم پر برسنا شروع کر دیا اوران پر ایسے اعتراضات کرنے شروع کر دیئے جن کے لکھنے سے بھی شرم آتی ہے۔

حالؔی نے کیا خوب کہا ہے:

جگر جس سے شق ہو وہ تحریر کرنی

چنانچہ اس پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ ایسی ناگفتہ بہ جرح وتنقید کی اگر کسی کو جرأت ہے تو وہ محدثین کرام میں سے خطیب بغدادی کی کتاب پڑھیں جو کئی جلدوں میں ہے اور حکم دیا کہ تم اپنا کام جلدی مکمل کرو۔ خاکسار نے ان کی خدمت میں ایک ہفتے کے بعد حاضر ہو کر اس قسم کی تحریر پیش کی۔ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت، استعارات وکنایات جس کے سامنے بڑے بڑے فصاحت اور بلاغت پر گھمنڈ کرنے والوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور اسے دوام بخشنے کے لئے خود قرآن کریم کی دس سورتوں کے برابر اپنا فصیح و بلیغ کلام پیش کریں اور جن مخالفین کی امداد کی توقع رکھتے ہیں ان سے بھی بھرپور امداد لیں ورنہ اس قسم کی افترا پردازیوں سے باز آجائیں۔ (سورۃ ۱۱' آیت نمبر۱۳' ۱۴ پارہ نمبر۱۲' رکوع نمبر۲) اور یہ بھی اعلان فرمایا کہ قرآن کریم کے تمام مخالفین ایک دوسرے کے زبردست پشت پناہ ہو کر اپنی طرف سے ایسا فصیح و بلیغ کلام پیش کریں اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گے (سورۃ نمبر سترہ' آیت نمبر ۸۸' پارہ ۱۵' رکوع ۱۰) قرآن کیرم کے ان اعلانوں کے سلسلے میں یہ اعلان بھی نوٹ کر لیں کہ تمام مخالفین قرآن پوری طاقت صرف کر کے بھی قرآن جیسی فصیح و بلیغ ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ ان دونوں کلاموں یعنی اس قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت اور تمہارے خود ساختہ فصیح و بلیغ کلام میں فیصلہ دینے کے لئے تم اپنی طرف ہی سے جج مقرر کر دو (سورۃ ۲' آیت نمبر۲۳ پارہ ایک' رکوع ۳)

علامہ سکاکی ابو یعقوب یوسف نے عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کے سلسلے میں ان عرق ریزیوں سے کام لیا کہ ان کی کتاب عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کی ایک معیاری کتاب ''المفتاح'' کے نام سے دنیا میں موجود ہے۔ اس کتاب کو کچھ اختصار کے ساتھ علامہ محمد بن عبدالرحمٰن قزوینی جامعہ دمشق کے خطیب نے تلخیص کے نام سے کتاب لکھی جس کی دو بڑی شرحیں علامہ تفتازانی (متوفی ۷۹۱ھ) نے لکھیں۔ جن میں سے ایک مولوی عالم کے نصاب میں مختصر المعانی اور دوسری شرح المطول جو مولوی فاضل کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کتب ''تلخیص المفتاح'' میں فصاحت و بلاغت کے کئی مسائل ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ کیا فصیح و بلیغ عربی زبان خصوصاً قرآن کریم جیسا بے مثل فصیح و بلیغ کلام الہٰی، مجاز لغوی اور مجاز عقلی، کلام کی فصاحت اور بلاغت میں اضافہ کا موجب ہے اور یہ مجاز و استعارہ، کنایہ تشبیہہ اس کلام کی فصاحت کو چار چاند لگاتا ہے۔ اعجاز العقلی فی القرآن کثیر۔ ہاں اس فعل میں مجاز عقلی کے لئے ضروری ہے۔ جو ظاہری نسبت روکنے کا موجب ہوتا ہے۔ بسا اوقات وہ قرینہ اس متکلم کے کلام میں خود موجود ہوتا ہے جسے قرینہ لفظیہ کہتے ہیں اور کبھی وہ قرینہ معنوی بھی ہوتا ہے۔ جب اس فعل کی نسبت اس فاعل کی طرف عقلاً، عادتاً اور شرعاً محال ہے۔

(مختصر المعانی ص ۱۳۱ مطبوعہ کانپور)

''کن''، تلخیص المفتاح کے مسائل میں سے ایک مسئلہ صنعت التفات ہے۔ کسی چیز کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے کلام میں ایک جگہ تو غائب قرار دیا جائے۔ پھر اسی کلام میں اسے متکلم یا مخاطب بنایا جائے' یہ التفات' ہے مثلاً سورۃ فاتحہ کی پہلی تین آیتوں پر آپ غور کریں۔ جن میں خدا تعالیٰ کا تذکرہ غائب میں ہے۔ چوتھی آیت میں مخاطب اور پانچویں میں مخاطب اس کا نام' صفت التفات' ہے اور (سورۃ نمبر ۱۰' آیت نمبر ۲۲' پارہ گیارہ' رکوع ۸) میں آپ دیکھیں گے کہ پہلے اور دوسرے جملے میں انسانوں کو مخاطب بنایا گیا ہے اور تیسرے جملے میں غائب اور (سورۃ نمبر ۷ آیت نمبر ۵۷' پارہ ۸' رکوع ۱۴) (مختصر المعانی ۶۴ مطبوعہ کانپور) ان مباحث میں خطاب کے متعلق ہے۔ تعریفی خطاب' اصل مخاطب میں ہیں۔ لیکن فتنے سے بچنے کیلئے مخاطب دوسرے کو بنا رہا ہوں۔

خطاب کی حقیقی صورت یہ ہے کہ ایک فرد مخاطب ہو تو اس کے لئے واحد کا لفظ مخصوص ہو' اور اگر جماعت مخاطب ہو' تو اس کیلئے جمع کا لفظ مخصوص ہو' لیکن تشبیہ ''واستعارۃ'' تعریضاً اور کنایۃً فصحا و بلغا کے کلام میں اس کا الٹ بھی ہوتا ہے۔ بظاہر ایک شخص مخاطب بنایا جا سکتا ہے لیکن جماعت کا ہر فرد اس کا مخاطب ہوتا ہے (مختصر المعانی ۳۶) اور بسا اوقات سادہ لوح انسان جس کو مخاطب سمجھتا ہے۔ وہ متکلم کے نزدیک مخاطب ہی نہیں ہوتا۔ فلا تکونن من الجھلین (سورۃ چھ' آیت ۳۵ پارہ ۷' رکوع ۱۰) اس دور کے عربوں کو کبھی وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے مخاطب سرور کائناتؐ ہیں بلکہ وہ پوری نسل انسانی ہے۔ جو انمٹ ہدایات خداوندی کا انکار کر رہی ہے اور (سورۃ نمبر ۱۰ پارہ گیارہ' رکوع ۱۵ آیت نمبر ۹۴، ۹۵) میں ہے۔ فان (۱) کنت فی شک مما انزلنا (۱) ایک خطاب واحد ہے اور مخاطب جماعت ہے۔ جس جماعت کے دل میں ہزاروں شکوک اور شبہات بھرے ہوئے تھے فسئل (۳) الذین یقرءون الکتب من قبلک (۴) ان سے پوچھو جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے تھے۔ لقد جاءک الحق (۵) پہنچ گئی ہیں تمہارے سامنے حق خدا کی انمٹ حقیقتیں اور ناقابل تردید صداقتیں فلا تکونن من (۶) الممترین تمہیں شک کرنے والوں میں سے کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ ولا (۷) تکونن من الذین کذبوا بایت اللہ کی آئتوں کو جھٹلانے والے مت بنو فتکون من (۸) الخسرین آٹھ کے آٹھ خطاب نسل انسانی کو ہیں۔ جو ان ہدایت خداوندی کے شکوک میں مبتلا تھے۔ حضورؐ مخاطب نہیں اس سے نسل انسانی مخاطب ہے اگر حضور کو خاکم بدہن مخاطب سمجھا جائے تو یہ صریح کفر ہے اس قسم کے خطابات سے مستشرقین کو یہود و نصاریٰ کو' ہنود کو اور غیر مسلموں کو حضورؐ کے خلاف دلائل کے طور پر پیش کیا گیا' چنانچہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے اسی سورۃ کی ۱۰۴ (ایک سو چار) آیت میں اس شکل میں پیش کیا۔ قل یایھا الناس ان کنتم فی شک اس آیت میں یہ واضح کر دیا کہ تم مخاطب ہو میں نہیں ہوں۔ اس سے مخاطب بگڑی ہوئی نسل انسانی ہے اور پہلے آٹھ خطابوں کی طرح ان واحد خطابوں کا مخاطب بھی بگڑی ہوئی نسل انسانی ہے۔ جیسا کہا گیا۔ فلا تکونن من الممترین' ولا تدع من دون

اللہ ملا ینفعک ولا یضرک فان فعلن فانک اذاً من الظلمین۔ اگر تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کا سلسلہ جاری رکھا۔ تو تم قیامت کے دن ظالموں کے زمرے سے اٹھو گے پھر اسی سورۃ کی ۱۰۸ (ایک سو آٹھ) نمبر آیت میں یوں خطاب فرمایا۔ قل یایہا الناس قد جاء کم الحق من ربکم اے بگڑی ہوئی نسل انسانی انمٹ صداقتیں اور نا قابل تردید حقیقتیں تم کو پہنچا دی گئیں۔

جب میں نے یہ رابطے علامہ صاحب کو سنائے تو انہوں نے اس خاکسار کو اپنے سینے سے لگا کر دعا کی۔ اللہ اس نوجوان کو اس سیدھی راہ پر قائم رکھ۔

(۹) حضرت علامہ اقبالؒ کو مبلغین کے لئے ایک ایسا نصاب مرتب کرنے کا عشق تھا کہ کسی غیر مسلم کو مسلمانوں کی پیش کردہ آیتوں کی آڑ نے حضرت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر راج پال کی طرح دریدہ ذہنی کا موقع نہ ملے۔ اس لئے خاکسار کو بار بار یاد فرماتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات اپنے مخلص احباب کی موجودگی میں فرضی طور پر معترض بن کر اعتراضات فرماتے تھے اور جواب کی فرمائش کرتے تھے۔ ایک دن اپنا خاص نمائندہ بھیج کر یاد فرمایا اور پہلا یہ اعتراض فرمایا جو (سورۃ نمبر ۸۰' آیت نمبر ۱۔۱۱' پارہ تیس' رکوع پہلا) کہ تم نے جو کسی گزشتہ محفل میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ آیت نمبر ایک اور دو وغیرہ میں غائب ضمیروں کا مرجع حضورؐ کی ذات گرامی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مرجع (سورۃ ۶۹ کی آیت ۳۷' ۳۸' ۴۳' ۴۴) میں مذکور ہے۔ جس سے نہایت مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ دین فروش' زر پرست زر اندوز مذہبی پیشوا ہیں۔ اور جن کے دل خوف خدا سے خالی ہیں۔ آج محفل میں تمہارا مزید امتحان لینا چاہتا ہوں کہ آیت نمبر تین چھ سات آٹھ تو دس میں مخاطب کون ہے؟ خاکسار نے ان کے جواب میں عرض کیا کہ قرآنی فصاحت اور بلاغت کے مسلمہ اصولوں میں ایک ضابطہ ''صنعت التفات'' ہے۔ اسی ضابطے کے ماتحت وہ گمراہ کن مذہبی پیشوا ہی مخاطب ہیں۔ جس کی تائید آیت گیارہ' بارہ سے ہوتی ہے آیت گیارہ کیا ہے؟ کلا تمہیں ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ تمہیں جو انمٹ ہدایتیں میری طرف سے دی جاتی ہیں۔ انہیں دوستوں سے بڑھ کر دشمنوں کے سامنے بھی ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے پیش کرنی چاہئیں انہیں قبول کرنا' ان کی تعمیل کرنا اور دوسروں کو ان کی تبلیغ کرنا۔ یہ ان کا فعل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس صنعت کو فصاحت و بلاغت کے ان مسلمہ ضابطوں کو جس بزرگ نے عمدہ ترتیب سے مرتب فرمایا۔ اس بزرگ کا نام کسی گذشتہ محفل میں علامہ سکا کی کہا گیا ہے۔ اس علمی محفل میں تم بتاؤ کہ اس کا نام نامی کیا تھا؟ اور کس سنہ میں اس کی وفات ہوئی؟ خاکسار نے عرض کیا کہ ان کا نام نامی یوسف بن محمد' کنیت یعقوب اور لقب سراج الدین اور ۵۲۲ ہجری میں ان کی وفات ہوئی تھی۔ اس مقدس محفل کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ سورۃ ۶۶ کی ابتدائی پانچ آیتوں کا تم کیا مطلب سمجھے ہو؟ خاکسار نے عرض کیا کہ آپ کی محفل میں جو علمائے کرام موجود ہیں۔ پہلے ان سے آپؒ دریافت فرما لیں۔ کہیں خاکسار کے الفاظ ان کو نا گوار نہ گزریں کہ ہمارے دور میں بزرگ محدثین تو کیا؟ مورخین پر اپنی خوش فہمی سے اتنا اعتماد

قائم ہو چکا ہے کہ انہیں ہر وقت انہیں کی عصمت کا وعظ فرمانا پڑتا ہے۔حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد کسی بزرگ تر صحابی تابعی اور کسی محدث اور فقیہہ کی عصمت کا نہ کسی نے دعویٰ کیا ہے نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے۔ان روایتوں کے راویوں کی روایت کی صحت پر جن بزرگ ائمہ کرام نے ان کی روایات کی صحت کا دعویٰ کیا ہے ان کے متعلق بھی صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ غیر معصوم بزرگوں کا ایک فیصلہ ہے۔خاکسار کی اس گزارش کو سننے کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ان بزرگوں کے خیالات میں کئی دنوں سے سن چکا ہوں۔اور ان لوگوں کے مقدس پیشواؤں کی کتابوں کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں۔تم اپنے خیالات کا اظہار کرو۔آیت نمبر ا میں یآ یھا النبی کے لفظ سے افتتاح فرمایا جو واحد مذکر مخاطب کی شکل میں ہے۔خطاب کیا ہے؟ ان کا مخاطب کون ہے خاکسار نے عرض کیا کہ ہمارے کثر بزرگوں نے اس کا مخاطب بھی حضور کو ٹھہرایا ہے۔لیکن میری ناقص رائے یہی ہے کہ اس کے مخاطب حضورؐ کے نام لیوا ہیں اور حضور کی امت کا ایک حصہ اس قبیح فعل کا صبح و شام مرتکب ہوتا ہے۔تحرم ما احل اللہ کو قرآن کریم نے ہر حالت میں قبیح فعل ٹھہرایا ہے۔ یا یہ کہ دوسرے شخص کو خوش کرنے کی خاطر اس کا دائرہ فقط الفاظ تک محدود ہو وہ بھی قبیح فعل ہے اور فقہائے کرام اور محدثین عظام جسے قسم ٹھہراتے ہیں مگر اس قسم ٹھہرانے سے وہ چیز حسین نہیں وہ سکتی۔قبیح ہی رہے گی اور اس قسم کی بے ہودہ قسم کی توڑنے کا قرآن بھی حکم دیتا ہے۔چنانچہ قرآن میں (سورۃ نمبر۲' آیت نمبر ۲۲۴' پارہ۲' رکوع ۱۲) یہ ارشاد فرمایا ہے کہ میرے نام پر قسم کھا کر نیک ترین کاموں کا سلسلہ مت روکو اور (سورۃ نمبر۲' آیت نمبر ۲۲۶) میں عربوں کی ایک ایسی رسم ہے' جسے وہ۔۔۔۔۔ کہتے تھے اور جتنی دیر تک چاہتے تھے۔ازدواجی زندگی کے حقوق خدا کی قسم کھا کر بند کر دیتے تھے اسے روکا اور آیت نمبر ۲۲۷ میں اعلان کیا کہ ازدواجی زندگی کے بگڑے ہوئے حالات کسی قسم کی اصلاح کے قابل نہیں رہے تو جس طرح ایک مجمع عام میں ازدواجی زندگی کا عہد و پیمان کیا تھا۔اسی طرح اسے طلاق دے کر توڑ دو۔اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۲۳۱ میں اس بدترین زیادتی اور ظالمانہ فعل اور ہدایت خداوندی کو ہنسی اور مذاق قرار دیا اور (سورۃ نمبر پانچ آیت نمبر ۸۷ پارہ سات' رکوع ۲) میں یہ واضح سے واضح تر اعلان فرمایا: یایھا الذین امنو الا تحرمو طیبت مااحل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین جو میں حدیں مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہیں کرنا۔اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۸۹ میں قسم توڑ کر کفارہ دینے کا حکم دیا۔اس لئے اس آیت میں امت ہی مخاطب ہے۔حضورؐ کی ذات گرامی جہاں میں خبیث افعال سے روکنے کیلئے آئی وہاں پاکیزہ ترین چیزوں کو حلال ٹھہرانے کیلئے آئی۔(سورۃ نمبر ۷ آیت نمبر ۱۵۷ پارہ ۹ رکوع ۹) اس لئے اس فعل کو کسی معنی میں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

پھر یہ بھی دیکھنے کے قابل چیز ہے تبتغی مرضات ازواجک کا کسی شکل میں حضور کو مخاطب نہیں بنایا جا سکتا اور وہ ذات پاک جو اللہ کی ہدایتوں کے مطابق یہ بار بار اعلان کرتا ہے۔کہ تمہیں ہر نیک کام پر اس وقت معاوضہ ملے گا۔جب

صرف خدا کی رضامندی تمہارے پیش نظر ہوگی اگر لفظ یـــا یھـــا الـــنبـــی کسی کو اس لغوترین خطاب کا مخاطب حضورؐ کو بنانے پر آمادہ کرتا ہے۔ تو ان بزرگوں کو (سورۃ ۳۳ آیت ۱ پارہ اکیس' رکوع ۱۷) کا مطالعہ فرمانا چاہیے۔ جس آیت کو یایھا النبی سے شروع کیا ہے۔ اس کے بعد وہ' طاب کے صیغے استعمال کئے ہیں جن کا مخاطب یہ بزرگ محدثین' مفسرین اور فقہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بناتے' کیونکہ یہ فعل حضورؐ کی شان نبوت کے خلاف ہے اتق اللہ یعنی ڈرو اللہ سے تقوی تو حضورؐ کا ذاتی فعل تھا اور نزول قرآن سے قبل بھی چالیس برس تک حضورؐ کے معجزانہ کمالات میں شمار ہوتا تھا۔ جو تقویٰ کا مجسمہ ہیں۔ امام سیوطیؒ نے اپنی مشہور تفسیر' اتقان' میں ایک حصہ خطابات قرآن کے متعلق لکھا ہے جس میں یہ تصریح کر جی ہے کہ جو فعل حضرت خاتم النبیینؑ کی شانکے خلاف ہے اس خطاب کا تعلق امت کے ساتھ ہے۔ حضورؐ کے ساتھ نہیں دوسرا خطاب اس آیت میں یہ ہے ولا تـــطـــع الکفرین والمنفقین معاذ اللہ اس کے مخاطب حضورؐ نہیں خاکم بدہن۔ اس کے مخاطب ہم ہیں جو ان کا کلمہ پڑھتے ہوئے خدا تعالیٰ کی ہدایتوں کے خلاف کفار کی ہدایتوں کی تعمیل و تبلیغ کرتے ہیں اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۴۸ میں یہی ناپسندیدہ خطاب حضورؐ کا نام لے کر امت کو مخاطب کیا گیا ہے۔ آثار تو شہادت دیتے ہیں کہ معاذ اللہ اس خطاب کا مخاطب بھی حضورک ہیں لکین اگر اس کا مخاطب حضورؐ کو بنیا جائے۔ تو حضورؐ کی عصمت اور پاک دامنی کی تمام عمارت ناپید ہو جاتیہے۔ لہذا سورۃ ٦٦ کی پہلی آیت میں امت ہی مخاطب ہے۔ جو آئے دن اس فعل قبیح کی مرتکب ہوتی رہتی ہے اس حقیقت کو اس سورۃ کی دوسری آیت میں یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ قد فرض اللہ لکم ایمانکم کہ انمٹ حقیقت ہے کہ تم اس قسم کی قسموں کو توڑ کر خدا تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا کفارہ ادا کر دو' لہذا قسمیں کھانے والے بھی ہم اور جن کو کفارہ ادا کرنیکا یہ حکم ہے وہ امت ہی ہے۔ ورنہ خاکم بدہن تـحـرم مـا احـل اللہ کی قسم حضورؐ کھائیں اور قسم کے توڑنے کا کیارہ امت ادا کرے' یہ کوئی مفہوم نہیں' لہذا دوسری آیت میں قسمی توڑ کر کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہی لوگ پہلی آیت میں یہ لغو قسمیں کھانے کے مخاطب ہیں۔ اسی سورۃ کی آیت نمبر تین میں یہ اعلان فرمایا کہ تم بن عورتوں کی رضا مندی حاصل کرنے کی لغو قسمیں کھاتے ہو۔ تو یہ تمہارے راز دوسروں کے سامنے افشا کرتی رہتی ہیں ے گو وہ عورتیں نبی کی بیویاں ہو کیوں نہ بن جائیں اور ان عورتوں کی مشکوک رضا مندی کا مفہو مجو تمہارے ذہن میں ہے وہ کبھی پورا نہ ہوگا۔

آیت نمبر ۴ اور ۵ میں جملہ شرطیہ کی شکل میں جو خطاب نظر آتا ہے اسے بھی علم فصاحت و بلاغت میں اپنے ایک اصول کے ماتحت طے کر دیا۔ عام طور پر عربی میں شرطیہ کے لئے تین حرف استعمال ہوتے ہیں' ۱۔ان ۲۔اذا ۳۔لو۔

اول الذکر اس شرطیہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جو ممکن الوقوع ہو۔

ثانی الذکر اس جملہ شرطیہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں شرط کا وقوع یقینی ہو۔

اور ثالث الذکر اس شرطیہ میں استعمال ہوتا ہے۔

جس شرطیہ میں شرط کا عدم وقوع یقینی ہو یا اس کا وقوع یقینی ہو۔ وہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(سورۃ ۴۳ کی آیت نمبر ۸۱ پارہ ۲۵ رکوع ۱۳) میں اسی شرطیہ پر غور فرمائیں: قل ان کان للرحمن ولد یہاں ان کے معنی لو کے ہیں یعنی بہ فرض محال اگر خداوند کریم کی کوئی اولاد ہوتی یعنی بیٹا یا بیٹی، تو میں اس کا پہلا عبادت گزار ہوتا۔ اس شرطیہ میں شرط کا وقوع محال اور ممنوع ہے۔ ورنہ ساری توحید کی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ لیکن لفظ ان، استعمال کر دیا اور پہلی سورۃ میں آیت نمبر ۲۳ پارہ پہلا، رکوع تیسرا) ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا یعنی ان کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ اس جملہ شرطیہ کی شرط کا وقوع یقینی ہے اور قرآن اس کا ذکر بار بار کرتا ہے۔ لفظ ان یہاں (اذا) کی جلہ استعمال ہوا ہے کیونکہ قرآن کریم کے مخالفین اس وقت شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور یہ شرط کے وقوع کا نہ صرف امکان تھا بلکہ اس کا وقوع یقینی تھا اس لئے اس آیت نمبر ۴ میں ان کے افشائے راز کرنے والی نبی کی بیویوں کے لئے دو جملے شرطیہ استعمال کئے۔ پہلا جملہ ان تتوبا الی اللہ افشائے راز پر جب تمہاری شان شایان ندامت موجود ہے۔ اس کی علت اور سبب یہ ہے کہ تمہارے دل ودماغ میں اور گفتار وکردار میں نبی کی محبت رچی بسی ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ آپ اگر کی بجائے جب سے کریں۔ یعنی ان کو اذا کے معنی میں استعمال کریں۔ تو کوئی الجھن نہیں پیدا ہوگی۔ بلکہ ازواج مطہرات کی مدح وستائش کا پہلو نکلے گا۔ دوسرے جملے کا مفہوم بھی یہی ہے اور ان اس جملہ شرطیہ میں حرف شرط ''لو'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اگر بفرض محال تم نے ایک دوسرے کی حمایت کی اور امداد کی خدانخواستہ اگر اس افشائے راز کی بجائے معین و مددگار بن گئیں اور اپنے اس ناپسندیدہ فعل پر بفرض محال ندامت کی جگہ تم نے ایک دوسرے کی پشت پناہی شروع کر دی۔ تو نبی کی شان میں کوئی فرق نہ پیدا ہوگا اس لئے کہ اس نبیؐ کے مددگار خداتعالیٰ اور فرشتے اور نیکوکار ایماندار موجود ہیں اور وہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں لہٰذا اس آیت میں بھی ''ان'' ''لو'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ ان کا افشائے راز اور اس مجرمانہ فعل پر اتحاد اور امداد باہمی کا وقوع محال ہے۔ اسی طرح آیت نمبر ۵ میں بھی، ان کا لفظ ''لو'' کے معنی میں مستعمل ہے۔ ان طلقکن اگر طلاق دے دی اس نے تم کو تو تمہارا ہی صرف نقصان ہوگا۔ وہ تو تمہاری جگہ تم سے بہتر عورتیں ہدایت، دعوت وتبلیغ خداوندی کے لئے منتخب کر لیں گے اس ترجمہ میں کئی قصے پیش کئے گیے ہیں۔ لیکن یہ سب غلط ہیں، کیونکہ ان یہاں بھی ''لو'' کے معنی میں استعمال ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شرطیہ کا عدم وقوع یقینی ہے یعنی وہ نبیؐ تمہاری مخلصانہ فداکاریوں کو دیکھتا، تو ہرگز طلاق نہیں دے گا۔ اور تم سے ازدواجی تعلقات منقطع نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ یہ تعلقات نبیؐ اور تمہاری مرضی اور تمہارے رشتہ داروں کی مرضی سے طے نہیں ہوئے بلکہ خدا تعالیٰ کی صریح ہدایتوں کے مطابق ہوئے ہیں۔

(سورۃ ۳۳، آیت نمبر ۲۸۔۲۹ پارہ ۲۲، رکوع پہلا)

یعنی نبی کریمؐ کو اس شرط کا اعلان کرنا پڑا کہ جو عورتیں آپ کی

ازدواجی زندگی میں آنا چاہیں اور پیغمبرؐ ان کو اپنی ازدواجی زندگی میں لانا چاہے۔ تو نا کے رشتہ داروں پر واضح کردے کہ اگر تم دنیاوی آسائشوں کو پیش نظر رکھ کر ان کی ازدواجی زندگی میں آنا چاہو تو تمہیں اس بات سے مجتنب رہنا چاہیے۔ اور یہ بھی اعلان فرما دیا اسی سورہ کی ۳۴ آیت میں کہ میرے بے مثل نبیؐ کی ازدواجی زندگی میں آنے والی نیکوکار عورتیں بھی بے نظیر و بے مثال ہیں اور ان کی یہ بے مثل صفت مرتے دم تک قائم رہے گی۔ اور نہیں خصوصیات کی وجہ سے نہیں امہات المومنین کا لقب خدا نے عطا فرمایا۔ (سورۃ ۳۳ آیت نمبر ۶ پارہ ۲۱ رکوع ۱۷) اور ان کی پاکیزہ ترین ازدواجی زادگی کا تذکرہ سورۃ ۳۳ کی آیت نمبر چونتیس میں کیا واذکرن مایتلی فی بیوتکن من ایت اللہ والحکمتہ یعنی تمہاری ازدواجی زندگی کا اہم ترین مقصد ہے کہ جہاں سیکڑوں ہزاروں مردوں کو حضورؐ قرآن کریم کی آیتوں کا امین بنا رہے ہیں اور صبح و شام ان کی تصدیق و تعمیل کے بعد ان کی تبلیغ کرنا ان کا فرض ٹھہراتے ہیں۔ اسی طرح اس نبی کا فرض ہے کہ رسمی طور پر ازدواجی تعلقات قائم کر لئے جائیں اور ان نیکوکا بے مثل عورتوں کو خدا کی بے مثل ہدایتوں کا بے تکلفی سے درس دیں اور اسی سورۃ ۳۳، آیت نمبر ۵۰ اور ۵۱ میں جہاں اس ازدواجی زندگی کے متعلق حضورؐ کے فرائض کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وہاں ازواج مطہرات کی یہ بے مثل خصوصیت بیان فرمائی ہے کہ ان کی آنکھیں حضورؐ کی محبت سے اس وقت ٹھنڈی ہوتی ہیں جب حضورؐ ہدایات خداوندی کا درس دینے میں زیادہ فرماتے ہیں تو بجائے رنجش و حسد کے ان کے دل میں مسرت و فرحت کے دریا بہنے لگتے ہیں اور ضروریات زندگی میں سے جو کچھ بھی حضور عطا فرماتے ہیں۔ اس عطیہ کی شاہی تخت و تاج سے زیادہ قدر کرتی ہیں بلکہ واقعات میں ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ عصر کے وقت تو معاشی زندگی کے اسباب و ذرائع ان میں آپؐ تقسیم فرماتے تھے اور شام کے وقت تک عشا کے وقت تک ضروریات زندگی کی کوئی چیز بھی اپنے گھر میں فالتو نہیں رہنے دیتے تھے اور ان تمام چیزوں کو بے کس اور بے نوا گھرانوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اور جب رب العالمین کی منشا کے مطابق ان بے مثل ٹرینڈ ازواج مطہرات کی تعداد پوری ہوگئی۔ تو حضورؐ کو حکم دیا اب ان کے بعد کسی عورت سے ازدواجی زندگی کا تعلق قائم مت کرو۔ بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ یہ بھی آپ نہیں کر سکتے کہ اگر کوئی عورت اعلیٰ سے اعلیٰ صفات کی مالک ہو۔ ان موجودہ ازواج مطہرات میں سے کسی کو الگ کر دیں اور اس کی جگہ اس اعلیٰ ترین اخلاق کی مجسمہ عورت کو اپنی ازدواجی زندگی میں لے آئیں اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۵۳ میں مسلمانوں کو ازواج مطہرات کی امہات المومنین ہونے کی یوں حقیقت بھی بیان فرما دی۔ ان تنکحوا ارزواجه من بعد ابدا ان ہدایت کو پیش نظر رکھ کر مفسرین کی الجھی ہوئی روایتوں میں کون پھنس سکتا ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے خاکسار کی یہ گزارشیں سننے کے بعد علما کی موجودگی میں فرمایا کہ بڑے بڑے محدثین نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے ان کی کسی لغزش سے متاثر ہو کر انہیں طلاق دے دی تھی۔ خاکسار نے گزارش کی کہ اس قرآن میں جو چودہ سو سال سے ہمارے پاس چلا آتا ہے۔ اس میں ان بیان کردہ واقعات

کے سوا کوئی واقعہ درج نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت صحیح بخاری میں موجود ہے جو ہمارے ان بزرگوں کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ کو ان کے قابل اعتماد دوست اور پڑوسی نے یہ حیران کن اطلاع دی کہ حضورؐ نے تمام ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے وہ اسی وقت تیار ہو کر مسجد نبوی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب مسجد نبوی میں حاضر ہوئے تو وہاں برگزیدہ صحابہ کرام کو روتا ہوا پایا۔ ان سے رونے کی وجہ پوچھی تو نہوں نے آپ کے پڑوسی کی تصدیق کی۔ چنانچہ آپ نے اس الجھن سے نکالنے کیلئے سرور کونینؐ کے دروازے پر کچھ وقفے ڈال کر تین دفعہ حاضر ہونے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اپنے مخصوص کارکن کے ذریعے اپنی معذوری کا اظہار فرمایا لیکن میری یہ خوش قسمتی تھی کہ کہ جب میں حجرہ مبارکہ سے دو چار قدم آگے نکلا تو حضورؐ کا خادم خاص دوڑتا ہوا پہنچا کہ حضورؐ یاد فرما رہے ہیں میری مسرت کی حد نہ رہی۔ اس بے حد مسرت کے ساتھ میں آپ کے دربار میں حاضر ہوا کہ خون آلود کپڑوں میں لپٹے ہوئے آپؐ ایک بڑا سرہانہ سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے ہوئے تھے اور فرش کی چٹائی بھی خون آلود تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔ آپؐ نے میری حیرت کو ختم کرنے کے لئے خود ارشاد فرمایا کہ کس مقصد کو پیش نظر رکھ کر تم آئے ہو؟ عرض کیا اے رسول کیا سچ مچ آپؐ نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی؟ آپؐ نے اس سوال سے متاثر ہو کر ارشاد فرمایا کہ بخدا ایسا کوئی واقعہ نہیں میں نے راویوں کی آہ و بکا کو ختم کرنے کے لئے نعرہ تکبیر بلند کیا آپؐ نے تکیہ کا ذرا سہارا لیتے ہوئے سنبھل کر فرمایا کہ مدینہ کے قرب و جوار میں ایک بستی میں جو مسلمان پارٹیوں کا کچھ جھگڑا تھا وہ عشا کے بعد میرے پاس آئے اور مجھے اپنی بستی میں لے جانے پر اصرار کیا۔ میں بین الناس کا فریضہ ادا کرنے کیلئے ان کی درخواست منظور کرتے ہوئے اپنی سواری پر اکیلا ہی روانہ ہو گیا اور جب صلح کرا کر واپس ہوا تو ایک گھاٹی میں سے گزرتے ہوئے میری سواری بے لگام ہو گئی۔ اس کے بے قابو ہونے کی وجہ سے میں گر گیا۔ لیکن چند قدموں پر سواری رک گئی۔ میں اس شدید ترین زخمی حالت میں اس پر سوار ہو کر گھر پہنچا اور ازواج مطہرات میری انتظار میں تھیں۔ مجھے اس شدید ترین زخمی حالت میں دیکھ کر آہ و بکا شروع کر دی۔ جو مجھے قطعاً ناگوار گزری کیونکہ وہ اپنی جگہ مجبور تھیں میں اپنی جگہ مجبور۔ ان کا فرض تھا کہ وہ میری حالت زار کو دیکھ کر آہ و بکا کا شکار ہوں اور میں اپنی جگہ۔ میں ان کو روکتے ہوئے انہیں کہا کہ میرے کمرے سے نکل جاؤ بس بات اتنی تھی جس کا بتنگڑ بن گیا۔

حضرت علامہؒ بے حد مسرور ہوئے اور مرحوم تاثیر پرنسپل اسلامیہ کالج کو حکم دیا کہ صبح جب ان کے درس میں جاؤ تو صحیح بخاری کا وہ صفحہ نوٹ کر کے لے آنا۔ لہذا میں ان کی مخلصانہ دعاؤں کے بعد رخصت ہو کر گھر آ گیا۔